کائناتِ جلیل مانکپوری

نتیجۂ فکر

استاد السلطان نواب فصاحت جنگ جلیل جانشین امیر مینائی لکھنوی

مرتب

علی احمد جلیلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

کائناتِ جلیل

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

کائناتِ جلیل مانکپوری

نتیجۂ فکر

استاد السلطان نواب فصاحت جنگ جلیل جانشین امیر مینائی لکھنوی

مرتب

علی احمد جلیلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Kainat-e-Jalil

Edited By : Ali Ahmad Jalili

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1985

دوسرا اڈیشن : 1999 تعداد 1100

قیمت : -/80

سلسلۂ مطبوعات : 502

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی-006 110

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

سوانحی خاکہ

نام ۔ حافظ جلیل حسن

تخلص ۔ جلیلؔ

القاب وخطاب ۔ جلیل القدر ۔ امام الفن ۔ فصاحت جنگ

وطن ۔ مانک پور ضلع پرتاب گڑھ (یو۔پی)

پیدائش ۔ 1864 میں بمقام مانکپور پیدا ہوئے

تعلیم ۔ 12 سال کی عمر میں حفظ قرآن کیا۔ فارسی و عربی کا درس اپنے والد حضرت شیخ حافظ مولانا عبدالکریم سے لیا۔ علوم متداولہ کی تعلیم لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل سے حاصل کی۔

تلمذ ۔ 1882 میں جناب امیر مینائیؔ کے سلسلۂ تلمذ سے وابستہ ہوئے۔

قیام رامپور ۔ 1886 میں اپنے استاد جناب امیرؔ کی طلبی پر ترک وطن کرکے رامپور چلے گئے جہاں امیر اللغات کے دفتر میں سکریٹری بنادیئے گئے 14 سال تک قیام رامپور ہی میں رہا۔

دکن میں آمد ۔ 1901 میں حضرت امیر مینائیؔ کے ساتھ حیدر آباد آئے۔

منصبِ اُستادی ۔ جناب داغؔ دہلوی کے انتقال کے ۵ سال بعد 1327 میں میر محبوب علی خاں آصف والیِ دکن نے جلیلؔ کو اپنی استادی کا شرف بخشا۔ شاہ آصف کے بعد میر عثمان علی خاں آصف سابع نے بھی جلیلؔ کو اپنا استاد بنایا۔

وفات ۔ مختصر علالت کے بعد 1946 میں انتقال ہوا۔

آخری آرام گاہ ۔ خطہ صالحین میں مدفون ہیں۔

ترتیب

آخری دَور

عرضِ مرتب

والدِ مرحوم فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری اس سلسلے کی آخری یادگار تھے جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا۔ ان کا تعلق لکھنؤ اسکول سے تھا۔ وہ خالص لکھنوی شاعر تھے تاہم انھوں نے اپنی ذات اور اپنی شاعری میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے دونوں مکاتیب کی خصوصیات یک جا کرلی تھیں۔ اس رنگ شاعری کو دہلی اور لکھنؤ اسکول کا سنگم کہنا درست ہوگا۔ وہ قدیم سلسلۂ تلمذ کے خاتم اور لکھنوی شاعری کی آخری یادگار تھے۔ جس طرزِ سخن کو انھوں نے رواج دیا وہ جراتؔ و مصحفیؔ کا ہے۔ جلیلؔ کے کلام میں ایک رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے جیسا وہ خود فرماتے ہیں۔

اس سخن کا جلیلؔ کیا کہنا　　　مصحفیؔ کی زبان ہے گویا

اس طرح جلیل کی غزلوں کا عام آہنگ وہی ہے جو قدیم کلاسیکی غزلوں کا تھا لیکن ان کا اجتہاد یہ ہے کہ انھوں نے روایات اور رسمیات کی نمود کو قایم رکھتے ہوئے ان پر ذاتی احساس، مشاہدہ اور اصلیت کا رنگ چڑھایا۔ بڑی شاعری روایت کے بھرپور احساس سے جنم لیتی ہے اور ہر بڑا شاعر روایت کے احساس سے اپنی شعری شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ جلیلؔ کے پاس روایت کا کتنا احساس و احترام تھا اور اس روایت میں رہ کر انھوں نے اپنی شخصیت و انفرادیت کی کتنی تلاش کی؟ اس کا جواب ان کا وہ سارا کلام ہے جو اس فن کا رانہ پختگی کا احساس دلاتا ہے۔ وہ قدیم و جدید کے جھگڑوں میں پڑے بغیر اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے "غزل میں حیات و کائنات کی گتھیاں نہیں سلجھائیں بلکہ ان گتھیوں میں الجھنے والے کو گہے طلطلے شود مستانہ می رقص کی دعوت دی۔ یہی ان کا آرٹ ہے" لیکن ان کے یہاں تنقید حیات نہ سہی ایک مزاج حیات ضرور ہے۔ انھوں نے شدتِ جذبات پر لطافتِ جذبات کو ترجیح دی چنانچہ ان کی شاعری کا سرمایہ یہی نفاست و لطافت ہے۔

جلیل کی باقیات میں تین ضخیم دیوان ہیں: تاجِ سخن، جانِ سخن اور روحِ سخن ـ جن میں اول الذکر دو ان کی زندگی ہی میں طبع ہو چکے تھے۔ ان کے آخری اڈیشن ۱۹۳۲ء میں نظامی پریس لکھنؤ سے نکلے تھے۔ اس کے بعد پھر طباعت کی نوبت نہیں آئی چنانچہ اب وہ نایاب و کمیاب ہیں کہیں ڈھونڈے نہیں ملتے۔ پبلشیروں اور احباب کے تقاضے مدت سے ہو رہے تھے لیکن نامساعد حالات کے سبب یہ کام جوں کا توں پڑا رہا۔ اب حالات کچھ سازگار ہوئے تو میں نے اپنی پہلی فرصت میں ادھر توجہ کی۔ تینوں دیوانوں کو مکمل صورت میں شائع کرنا اب بھی ممکن نہ تھا اس لیے میں نے ایک ہی مجموعہ "کائناتِ جلیل" میں تینوں کو یکجا کر دیا ہے طوالت کے سبب سارا کلام تو اس میں جگہ نہیں پا سکا تاہم کلام کا ایک بڑا حصہ تو محفوظ ہو گیا۔ غزلوں کو خلط ملط کر دینے کے بجائے میں نے سنہ واری ترتیب کے ساتھ تینوں دیوانوں کی انفرادیت کو علیحدہ علیحدہ قائم رکھا ہے۔ ایسا کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ تینوں دیوان اپنے رنگ و آہنگ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان دواوین کے پس منظر میں جلیل کی شاعری کو میں نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور امیرؔ کی شاعری سے شروع ہو کر تاجِ سخن دیوان اوّل کی اشاعت پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جلیلؔ پر امیرؔ مسلط تھے۔ انھیں کے رنگ کا پرتو کلام پر تھا۔ دوسرے دور کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب جلیلؔ استادِ شاہ بن کر دکن میں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ عام شاعری کا رنگ اس وقت تک بہت بدل چکا تھا۔ سادگی زبان و خیال کی طرف زیادہ توجہ دی جا رہی تھی اور اسی طرزِ شاعری کو دکن میں قبولِ عام حاصل تھا۔ غیر شعوری طور پر اس کا اثر خلیل پر بھی پڑا۔ دوسرے دیوان جانِ سخن کی غزلیں اس رنگ کی ترجمان ہیں۔ تیسرے دور کا تعلق جلیلؔ کی زندگی کے آخری حصے سے ہے جب شعری رجحانات تیزی سے بدل رہے تھے۔ انقلاب کی اس ہوا میں جلیل نے اپنی موم بتی والی شمع روشن رکھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ آخر زمانے میں غزل کے مضامین اسلوب بیان اور اندازِ تفکر میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور پیدا ہو گئی جس کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس تیسرے دیوان روحِ سخن میں دوسرے دور کی آئینہ داری کرنے والی غزلوں کے ساتھ ایسی غزلوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو نئی تبدیلیوں کی آئینہ دار ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جلیل کی شاعری جس جس دور سے گزری اور جو اثرات اس نے قبول کیے ان کا جائزہ تینوں دواوین کے حوالے سے سنہ واری طور پر لیا جائے۔ جائزہ لینے سے پہلے تینوں دواوین کے کچھ اشعار کا انتخاب ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ بیک نظر مختلف رنگوں کے فرق کا اندازہ کیا جا سکے۔

لطافت سے مرا محبوب تصویرِ خیالی ہے   وہ پہلو میں ہے اور پہلو مرا خالی کا خالی ہے

موجِ ہوا حباب کو سنگِ گراں ہوئی   لیتے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا

اٹھتا ہوں میں جو دشت سے جانے کو اے جنوں   کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

مدارِ زندگی ٹھہرا نفس کی آمد و شد پر   ہوا کے زور سے روشن چراغِ زندگانی ہے

لے اڑی گھونگھٹ کے اندر سے نگاہِ مست ہوش   آج ساقی نے پلائی مے ہمیں چھانی ہوئی

(تاجِ سخن)

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی   آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

موسمِ گل میں عجب رنگ ہے مے خانے کا   شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

مری نظر نے عجب کارِ لاجواب کیا   کہ تم کو لاکھ حسینوں میں انتخاب کیا

عہدِ شباب چشمِ زدن میں گزر گیا   جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی   ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

(جانِ سخن)

ادا ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی   نگاہِ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی

منحصر تھا تری زلفوں کے بکھر جانے پر   کسی شیرازۂ ہستی کا پریشاں ہونا

عجب حوصلہ ہم نے غنچے کا دیکھا   تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

سب باندھ چکے کب کے سرِ شاخ نشیمن   ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں

نفس کی طرح کوچے میں کسی کے   ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں

(تاج سخن)

تاج سخن پہلی مرتبہ ۱۹۱۰ء میں اختر دکن پریس حیدر آباد میں چھپا۔ یہ نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کا دورِ حکومت تھا اور جلیل، جلیل القدر کے خطاب سے مفتخر ہو کر داغ کی جگہ استاد شاہ ہونے کا اعزاز حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ اس دیوان اوّل میں غزلیات سے قبل وہ مدحیہ قصیدہ بھی درج ہے جو اس سرفرازی کے موقع پر شاہ آصف کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس دیوان میں وہ تمام غزلیں موجود ہیں جو زمانۂ رام پور سے حیدر آباد میں اس دیوان کی اشاعت تک وقتاً فوقتاً کہی گئی تھیں۔ جلیل کا یہ دیوان اپنے استاد امیر مینائی کے رنگ میں ہے بیشتر غزلوں پر امیر کے دیوان مراۃ الغیب کا دھوکا ہوتا ہے۔ کلام میں اس قدر ہم رنگی ہے کہ اگر دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو تمیز کرنا دشوار ہو جائے۔

شعر گوئی پہ تری سب کو گماں ہے کہ جلیل   بزم میں روح امیر الشعرا آئی ہے

اس دیوان کے اشعار فصاحت و بلاغت کا مرقع ہیں اور اعلیٰ درجہ کی کلاسیکیت رکھتے ہیں۔ بلند خیالی، معنی آفرینی اور محاورات کی کثرت ہے۔ استعارات و تشبیہات کی فراوانی اور رنگ ناسخ کی رعایت لفظی کی پیروی بھی ملتی ہے۔ تاج سخن کے اب تک تین اڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری اڈیشن آج سے ۵۴ سال پہلے ۱۹۳۲ء میں نکلا تھا۔

جان سخن دوسرا دیوان ہے۔ جو تاج سخن کی اشاعت کے ۶ سال بعد ہی یعنی ۱۹۱۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آگیا۔ شاہ آصف کے بعد اس وقت میر عثمان علی خاں والیِ دکن تھے اور جلیل کو ان کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ چنانچہ اس دیوان کا آغاز ان کی مدح میں لکھے ہوئے ایک قصیدہ سے ہوتا ہے یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جان سخن کی بیشتر غزلیں شاہ عثمان کی فرمایش پر لکھی گئی تھیں۔ یہ غزلیں جلیل کی شاعری کے دوسرے دور کی نمایندگی کرتی ہیں۔ اس وقت عام ادبی ماحول کا تقاضا کچھ اور ہی تھا۔ دلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کی طرز شاعری میں تبدیلی آچکی تھی۔ اسیر و امیر کی شاعری کا رنگ رفتہ رفتہ زائل ہو رہا تھا اور اس کی جگہ سادگی و صفائی نے لے لی تھی۔ غیر شعوری طور پر یہ اثرات جلیل نے بھی قبول کئے۔ استاد شاہ اور مصاحب خاص ہونے کی وجہ سے ان کی شاعری درباری اثرات سے بھی علیحدہ نہ

رہ سکی چنانچہ اس دور کی غزلوں میں صفائی و سادگی اور رنگینی و شوخی کا بڑا اہتمام ہے۔ صنائع بدائع اور تشبیہات و استعارات صرف بقدر ضرورت ہیں۔ زبان کو جلیل نے عام لب و لہجہ، روز مرہ اور بول چال کے قریب رکھا ہے جس کی وجہ سے اشعار کی اپیل اور تاثیر بڑھ گئی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ چونکہ یہ جلیل کی فراغت اور خوش حالی کا زمانہ تھا اس لیے میر کی شاعری کے سوز و گداز کے برعکس نشاطیہ کیفیت کی فراوانی ہے۔

وصالِ یار بھی ہے دَور میں شراب بھی ہے ۔۔۔ قمر بھی ہے مرے پہلو میں آفتاب بھی ہے

روحِ سخن تیسرا دیوان ہے جو جلیل کی زندگی ہی میں ترتیب پا گیا تھا لیکن شائع نہ ہو سکا۔ وفات کے ۱۰ سال بعد برادرم مشتاق جلیلی اور میری نگرانی میں اس کا ایک انتخاب مختصر دیوان کی صورت میں بمبئی کے کیو پریس میں چھاپا گیا۔ اس انتخاب میں مزید اضافہ کرنے کے بعد اب اسے بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ روحِ سخن میں آخری ۲۰ سال کا کلام ہے۔ اس طویل مدت کے شعری سرمایہ کو میں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ کی غزلیں اپنی روایت کے لحاظ سے تاجِ سخن اور جانِ سخن سے قریب ہیں۔ البتہ دوسرے حصہ یعنی آخری دَور کی غزلوں کا آہنگ ان سے جدا ہے۔ اس دَور میں جلیل کی شاعری کا عام انداز پچھلی شاعری سے یقیناً بلند ہے۔ شاعری اپنے ارتقا کی آخری بلندیوں پر نظر آتی ہے جہاں بدلتے ہوئے رجحانات اور ادبی انقلاب کا ایک دھندلا سا عکس، کہیں کہیں جدتِ اسلوب، تنوعِ مضامین اور کچھ نئی ترکیبوں کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ شاعری زندگی سے قریب آ گئی ہے اور پیری نے اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے جیسا کہ جلیل کی آخری غزل کے اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

پھنسا کے دام میں پیری کے بیکس و تنہا ۔۔۔ کہاں گئی مری عمرِ رواں نہیں معلوم

مجموعی طور پر جلیل کے یہاں زبان کی صفائی، سلاست، لہجے کی شگفتگی، محاوروں کا استعمال، بندش کی چستی، شوخی و رنگینی، ردیف و قوافی کا متنوع استعمال، غنائی کیفیت، شبنم کی نرمی، شعلۂ گل کی گرمی، اسلوب کا رکھ رکھاؤ اور ان سب سے زیادہ ایک مہذب سطح اور ایسا ستھرا پن ملتا ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ جلیل کی زبان لکھنوی، مستند اور فصیح زبان ہے جس طرح ناسخ کے احسان سے اردو زبان سبک دوش نہیں ہو سکتی اسی طرح جلیل نے بھی اپنے فن سے زبان و شعر کی جو خدمت کی بالخصوص دکن کی زبان پر جو اثرات چھوڑے اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔

مجھے اس مجموعہ "کائنات جلیل" کو اہل ذوق کے سامنے پیش کرتے ہوئے بڑی خوشی ہورہی ہے کائنات جلیل کی طباعت ایک طرف تو میری دیرینہ آرزو کی تکمیل ہے دوسری طرف ایسے وقت میں جبکہ کلام جلیل ہندو پاک میں کہیں دستیاب نہیں ہوتا اس کا چھپ کر بازار میں آجانا وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

علی احمد جلیلی

محلہ سلطان پورہ
حیدرآباد ۲۴. (اے پی)

حمد

منہ میں گویا ہے زباں حمدِ الٰہی کے لیے
دل سپاسِ کرمِ لامتناہی کے لیے

سلطنت اس کی، زمیں اس کی، فلک اس کا ہے
مختصر یہ کہ خدائی ہے خدا ہی کے لیے

در پہ اس قادرِ بے چوں کے گدا کا سر کیا
وہ بھی جھکتا ہے جو ہے افسرِ شاہی کے لیے

حشر ہنگامہ اُٹھاتا ہے، اُٹھائے، کیا خوف
رحمتِ حق ہے یہاں پشت پناہی کے لیے

آگ میں زندہ سمندر کو وہی رکھتا ہے
آب میں رزق رساں ہے وہی ماہی کے لیے

یادِ حق میں یہ سدا رونق و آبادی ہے
دل جو غافل ہے وہ مسکن ہے تباہی کے لیے

خرقہ کس کام کا جب تک نہ ہو درویش جلیل
جامۂ حرب تو زیبا ہے سپاہی کے لیے

نعت

جب زباں پر مری نامِ شہ بطحا آیا
عمرِ رفتہ پلٹ آئی کہ مسیحا آیا

جس قدر وادیٔ غربت میں چبھے تھے کانٹے
پھول سب ہو گئے جس وقت مدینا آیا

سایۂ قد کو جو قدرت نے اٹھا رکھا تھا
کام اُمّت کے وہی حشر میں سایا آیا

کاش آئے یہ مجھے حکم کہ آ یثرب میں
میں پکاروں مرے مولا مرے آقا آیا

یا نبیؐ کہہ کے جو کشتی کا اٹھایا لنگر
وجد موجوں نے کیا جوش میں دریا آیا

ہو گئی بے خودیٔ شوق میں طے راہ دراز
آنکھ کھولی تو نظر گنبدِ خضریٰ آیا

صرف حبِّ نبویؐ حشر میں کام آئی جلیلؔ
طاعتیں آئیں نہ زہد آیا نہ تقویٰ آیا

سلام

ہائے شبیرؑ نہ پائیں لبِ دریا پانی
بات ایسی ہے کہ ہوتا ہے کلیجا پانی

آؤ فیضِ خلفِ ساقیِ کوثر دیکھو
یہ جگہ وہ ہے جہاں بھرتے ہیں دریا پانی

نامِ شبیرؑ سے ملتی ہے وہ لذت دل کو
جیسے پیاسے کو مزہ دیتا ہے ٹھنڈا پانی

ایسے تردست تھے شمشیر زنی میں عباسؑ
جس پہ اک ہاتھ پڑا اس نے نہ مانگا پانی

پیاس میں صبر تھا مقصودِ شہِ دیں ورنہ
قدمِ پاک کے نیچے سے اُبلتا پانی

بھوکے پیاسوں کے جو قاتل تھے نہ سوچے لٹنا
ذبح کرتے ہیں تو دے لیتے ہیں دانا پانی

ذکرِ شبیرؑ سے ہوتا ہے یہ حال آنکھوں کا
جس طرح دینے لگے پھوٹ کے چھالا پانی

نہ خبر اہلِ وطن کی نہ رہائی کی اُمید
شام کا ملک اسیروں کو تھا کالا پانی

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے میں قربان جلیلؔ
ان پیالوں میں ہے کوثر کا چھلکتا پانی

منقبت

آج قسمت درِ خواجہؒ پہ مجھے لائی ہے
یہی وہ در ہے جہاں لطفِ جبیں سائی ہے

تھا بہت دور مگر کھینچ بلایا مجھ کو
جانتے تھے کہ یہ مدت کا تمنائی ہے

مجھ کو دیکھو قدمِ حضرتِ خواجہؒ دیکھو
آج تو ذرّہ و خورشید میں یکجائی ہے

خاک بوسی کو جھکا ہوں تو دھڑکتے دل سے
میرے خواجہؒ مرے خواجہؒ کی صدا آئی ہے

مرحبا دولتِ دارین لُٹانے والے
کس نے اس در سے مرادِ اپنی نہیں پائی ہے

محو کر دیتی ہے انساں کو تجلّی اس کی
خود تماشا ہے جو روضے کا تماشائی ہے

نذر کے واسطے کچھ اور مرے پاس نہیں
صرف اِک درد کا مارا دلِ شیدائی ہے

کچھ کہے کوئی مگر میں تو کہوں گا یہ جلیلؔ
جس کو خواجہؒ کا نہ سودا ہو وہ سودائی ہے

قصیدۂ سرفرازی

در مدح نواب میر محبوب علی خاں بہادر آصف نظام الملک سلطان دکن

جو دن پھرتے ہیں تو ساماں پیدا ہو ہی جاتا ہے
شبِ غم لاکھ طوفانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے

چمن میں پھولنے پھلنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے
دکن میں بارور نخلِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

رہا جو شہ کی نظروں میں ترقی اس کو لازم ہے
ملا دریا سے جو قطرہ وہ دریا ہو ہی جاتا ہے

چمک ذرے میں سورج کی کرن سے آ ہی جاتی ہے
درِ شہ کا گدا ادنیٰ سے اعلیٰ ہو ہی جاتا ہے

جو دل سے ہو رہا محبوب کا اس کو کمی کیا ہے
موافق آسماں، تابع زمانہ ہو ہی جاتا ہے

برے گل زار میں رنگِ خزاں کب تک جما رہتا
کہ اک دن فصلِ گل کا دور دورا ہو ہی جاتا ہے

توقع شاہ سے رکھنا کبھی خالی نہیں جاتا
یہ دیکھا ہے کہ فضلِ حق تعالیٰ ہو ہی جاتا ہے

اشارہ چاہیے پھر مشکل آساں ہو ہی جاتی ہے
سہارا چاہیے پھر بوجھ ہلکا ہو ہی جاتا ہے

مسیحا جب کرم فرما ہوا پھر پوچھنا کیا ہے
دوا ہو یا نہ ہو بیمار اچھا ہو ہی جاتا ہے

تجسس شاہدِ مقصود کا ضائع نہیں جاتا
وہ اک دن زیبِ آغوشِ تمنا ہو ہی جاتا ہے

عقیدت جب ہوئی پوری تو کیسا پردہ دوری
رخِ محبوب دل میں جلوہ آرا ہو ہی جاتا ہے

بجا ہے اب عروسِ شاعری کا دون کی لینا
شباب آتا ہے تو جوبن دوبالا ہو ہی جاتا ہے

گلِ مضموں جو کل تک خشک تھے اس کا تعجب کیا
خزاں کے دور میں ہر پھول کانٹا ہو ہی جاتا ہے

نہ میں اچھا نہ میرے شعر اچھے بات اتنی ہے
جسے اچھا کہیں سرکار اچھا ہو ہی جاتا ہے

جلیلؔ زار کو دیکھو جلیل القدر کو دیکھو
لقب جو شاہ سے ملتا ہے زیبا ہو ہی جاتا ہے

تعجب کیوں کسی کو ہو ہماری سرفرازی پر
خدا کا فضل ہوتا ہے تو ایسا ہو ہی جاتا ہے

یہ ایسی سرفرازی ہے، یہ وہ ذرّہ نوازی ہے ۔۔۔ نہ کچھ کہئے مگر لوگوں میں چرچا ہو ہی جاتا ہے
لکھوں اب شکریے کے ساتھ کچھ مدحِ شہِ والا ۔۔۔ کہ اس موقع پہ دل میں جوش پیدا ہو ہی جاتا ہے
یہ مدحِ شاہ وہ مضموں ہے جس کے نظم کرنے کا ۔۔۔ ارادہ میں نہیں کرتا ارادا ہو ہی جاتا ہے

مطلع

کمالِ شاہ پر انسان شیدا ہو ہی جاتا ہے ۔۔۔ جمالِ شاہ کو دیکھو تو سکتا ہو ہی جاتا ہے
نظر جس کی پڑی آئینۂ روئے مبارک پر ۔۔۔ نصیب اس کو سکندر کا نصیبا ہو ہی جاتا ہے
سواری کا سماں سو بار دیکھا ہے مگر پھر بھی ۔۔۔ سلیماں کا شہِ آصف پہ دھوکا ہو ہی جاتا ہے
خدا رکھے شہِ جم جاہ کا ہے رعب اب ایسا ۔۔۔ کسی کا بخت ہو ٹیڑھا تو سیدھا ہو ہی جاتا ہے
تجلّی محو کر دیتی ہے ایوانِ معلیٰ کی ۔۔۔ درِ شہ کا تماشائی تماشا ہو ہی جاتا ہے
بہت دور آپ کو کھینچے جو کوئی فائدہ کیا ہے ۔۔۔ خدنگِ لطفِ شاہی کا نشانا ہو ہی جاتا ہے
مثالِ ماہِ تاباں انجمن آرا جو ہوتے ہیں ۔۔۔ تو شاہانِ جہاں کا حلقہ ہالا ہو ہی جاتا ہے
کمالِ شاہ کا اللہ اکبر کیا تصرف ہے ۔۔۔ کوئی ارماں ہو دم بھر میں پورا ہو ہی جاتا ہے
سزا کے واسطے دل میں کوئی پہلو نہیں آتا ۔۔۔ عطا کے واسطے کوئی بہانا ہو ہی جاتا ہے
مرے شہ کی سخاوت مشک کی تاثیر رکھتی ہے ۔۔۔ چھپا کر لاکھ دیں عالم میں شہرا ہو ہی جاتا ہے
ہمیشہ فیض جاری ہے ہمیشہ خیر جاری ہے ۔۔۔ لٹاتا ہے جو موتی دل کا دریا ہو ہی جاتا ہے
عجب عہدِ مبارک ہے کہ جب چاہو جہاں چاہو ۔۔۔ خوشی کا عیش کا ساماں مہیا ہو ہی جاتا ہے
مسافر کو سفر کی دھوپ میں ایذا نہیں ہوتی ۔۔۔ کہ سر پر دامنِ دولت کا سایا ہو ہی جاتا ہے
دل آئینہ ہے اور اس میں خواصِ جامِ خسرو ہے ۔۔۔ کسی کا رازِ دل ہو آشکارا ہو ہی جاتا ہے
سبق دیتے ہیں لقماں کو فلاطونِ زماں ہو کر ۔۔۔ ہوا جو بندۂ بے دام دانا ہو ہی جاتا ہے
کلامِ خسروی کیوں کر نہ دنیا سے نرالا ہو ۔۔۔ شہِ یکتا کا ہر مضمون یکتا ہو ہی جاتا ہے
خدا رکھے جہاں دو گل کھلائے طبعِ رنگیں نے ۔۔۔ گلستاں بوستاں کا رنگ پھیکا ہو ہی جاتا ہے
زباں پر طوطیِ ہندستاں کو وجد آتا ہے ۔۔۔ بیاں پر بلبلِ شیراز شیدا ہو ہی جاتا ہے
قلق کو داغ آتش کو جلن، جامی کو بیہوشی ۔۔۔ صبا کو بے کلی سودا کو سودا ہو ہی جاتا ہے
بجا ہے سامعیں کا مثلِ قمری نعرہ زن ہونا ۔۔۔ کہ اک اک شعرِ موزوں سرو رعنا ہو ہی جاتا ہے
زمینِ سخت میں بھی معنیِ روشن نکلتے ہیں ۔۔۔ صدف میں دُر حجر میں لعل پیدا ہو ہی جاتا ہے

بناوٹ کی ضرورت کیا تصنع کی ہے حاجت کیا　　طبیعت ہو جو بانکی شعر بانکا ہو ہی جاتا ہے
مجھے دعویٰ نہیں لیکن ثنا جب شہ کی لکھتا ہوں　　سخن کو اپنی یکتائی کا دعوا ہو ہی جاتا ہے
کوئی مانے نہ مانے میں تو ہوں اس فیض کا قائل　　زمیں مشکل سے مشکل ہو قصیدا ہو ہی جاتا ہے
جلیلؔ آصف کے حق میں دعا دل سے نکلتی ہے
اثر فضلِ خدا سے اس میں پیدا ہو ہی جاتا ہے

تاج سخن

دیوانِ اوّل

۱۸۸۷ء ـــــ ۱۹۰۹ء

یارب قبولِ عام ملے اِس کلام کو
دل کی جگہ بغل میں ہو دیواں جلیلؔ کا

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

ہے لاکھ لاکھ شکر خدائے جلیل کا
جس نے دُرِ سخن سے بھرا منہ جلیل کا

خود فرش خاک پر ہے نظر عرش پاک پر
اللہ رے حوصلہ ترے عبدِ ذلیل کا

پیاسا کسی کے شربتِ دیدار کا ہوں میں
چھینٹا نہ دے بہشت مجھے سلسبیل کا

اللہ تک پہنچ کا ذریعہ یقین ہے
جنّت کو دخل ہے نہ گزر ہے دلیل کا

یارب بتوں کو کعبۂ دل سے نکال دے
صدقہ نبیؐ کا واسطہ اپنے خلیل کا

کس کی مجال ہے ترے اوصاف لکھ سکے
یاں ہے قلم شکستہ پرِ جبرئیل کا

یارب قبولِ عام ملے اس کلام کو
دل کی جگہ بغل میں ہو دیوان جلیل کا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا
نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا

بلبل کی بہار میں نہ پوچھو
منھ چومتی ہے کلی کلی کا

ہر وقت ہیں موت کی دعائیں
اللہ رے لطف زندگی کا

غنچوں کو صبا نے گدگدایا
دشوار ہے ضبط اب ہنسی کا

سمجھے تھے نہ ہم کہ تم پہ مرنا
ہو جائے گا روگ زندگی کا

ہوں ایک سے سب حسین کیونکر
ہے رنگ جُدا کلی کلی کا

منھ پھیر کے یوں چلی جوانی
یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

آئینہ بنا رہے ہو دل کا
دل ٹوٹ نہ جائے آرسی کا

دیکھو نہ جلیلؔ کو مٹاؤ
مٹ جائے گا نام عاشقی کا

پیارا پیارا حُسن دیکھا دل کو پیارا ہوگیا
جو حسیں چمکا مری آنکھوں کا تارا ہوگیا

میری ہستی نے مجھے اک چھوڑ دو صدمے دیے
ہاتھ سے شیشہ گرا، دل پارہ پارا ہوگیا

زینتِ آغوش ہو کر ڈھل گیا سانچے میں حسن
پیار کرنے سے مرے وہ اور پیارا ہوگیا

خال و عارض نے فلک کی ساری رونق چھین لی
چاند کوئی بن گیا کوئی ستارا ہوگیا

ایک شوخی ان کی کر جاتی ہے سب کچھ بزم میں
اس سے باتیں ہوگئیں اُس سے اشارا ہوگیا

کر کے وعدہ دی گرہ آنچل میں اس نے شکر ہے
اک ذرا ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہوگیا

ہجر کی شب میں نہ چمکا صبح کا تارا کوئی
ہائے وہ بھی میری قسمت کا ستارا ہوگیا

بد دعا نکلی لبِ جاں بخشِ جاناں سے جلیلؔ
عاشقوں کو مرنے جینے کا سہارا ہوگیا

زیبا یہ نہ تھا تم کو دل دے کے دغا کرنا
ان ہونٹوں سے کیا کہنا، ان ہاتھوں سے کیا کرنا

مجھ کو یہ مرے دل نے جاتے ہوئے سمجھایا
دلبر کی جفا سہنا، قسمت کا گلا کرنا

راتوں کو نکلتے ہو یہ بھی کوئی پردہ ہے
غیروں سے ملا کرنا، سایے سے حیا کرنا

رو رو کے بیاں کرنا حسرت مری اے قاصد
کہنے میں نہ جو آئے آنکھوں سے ادا کرنا

تم سچے ہمیں جھوٹے جانے بھی دو یہ جھگڑا
گزری جو گزرنی تھی اب چاہیے کیا کرنا

میں نے جو تمھیں چاہا کیا اس میں خطا میری
یہ تم ہو یہ آئینہ انصاف ذرا کرنا

تسکیں کو تری اے دل قاصد کی یہ باتیں ہیں
وہ آئے نہ آئیں گے بس یونہی سُنا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دُعا کرنا

اس آپ کی غفلت پر افسوس جلیلؔ افسوس
کیا کر چلے دنیا سے تھا آپ کو کیا کرنا

رنگت یہ رُخ کی اور یہ عالم نقاب کا
دامن میں کوئی پھول لیے ہے گلاب کا

چاروں طرف سے اس پہ نگاہوں کا بار ہے
مشکل ہے ان کو رُخ سے اُٹھانا نقاب کا

تسکینِ خاک دیتے ہیں رکھ کر جگر پہ ہاتھ
پہلو بدل رہے ہیں مرے اضطراب کا

مدت ہوئی وہی ہے زمانے کا انقلاب
نقشا کھنچا ہوا ہے مرے اضطراب کا

بچپن کہاں تک ان کی امنگوں کو روکتا
آخر کو رنگ پھوٹ ہی نکلا شباب کا

رونا خوشی کا روتی ہے بلبل بہار میں
چھڑکاؤ ہو رہا ہے چمن میں گلاب کا

جھلکی دکھا کے اور وہ بجلی گرا گئے
اچھا کیا علاج مرے اضطراب کا

خاکِ چمن پہ شبنم و گل کا عجب ہے رنگ
ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

کھوئے ہوئے ہیں شاہدِ معنی کی دُھن میں ہم
یہ بھی جلیلؔ ایک جنوں ہے شباب کا

گھٹا دیا رتبہ ہر حسیں کا مٹا دیا رنگ حورِ عیں کا
نہیں ہے یہ چاند چودھویں کا شباب ہے میرے مہ جبیں کا

تمھیں سے روئے زمیں معطر تمھیں سے سطحِ فلک منور
تمھیں تو ہو پھول یاسمیں کا تمھیں تو ہو چاند چودھویں کا

یہ رات اتنی جو بڑھ گئی ہے سیاہی اتنی جو چڑھ گئی ہے
کہیں کھُلا ہے ضرور جوڑا کسی کے گیسوئے عنبریں کا

نہ شوقِ نظارہ مجھ سے پوچھو یہ کہہ کے سوتا ہوں روزِ شب کو
اٹھوں جو میں صبح کو الٰہی تو منہ دکھانا کسی حسیں کا

جلیل کیا بات اس سخن کی غزل میں ہے تازگی چمن کی
جو شعر ہے شاخِ نسترن کی جو لفظ ہے پھول یاسمیں کا

وصل میں وہ چھیڑنے کا حوصلہ جاتا رہا
تم گلے سے کیا ملے سارا گلہ جاتا رہا

یار تک پہنچا دیا بیتابیٔ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

ایک تو آنکھیں دکھائیں پھر یہ شوخی سے کہا
کیجیے اب تو کم نگاہی کا گِلہ جاتا رہا

روز جاتے تھے خط اپنے روز آتے تھے پیام
ایک مدت ہوگئی وہ سلسلہ جاتا رہا

رو رہے تھے دل کو ہم یاں ہوش بھی جاتے رہے
گم شدہ یوسف کے پیچھے قافلہ جاتا رہا

مڑ کے قاتل نے نہ دیکھا وار پورا ہوگیا
کشتگانِ نیم بسمل کا گِلہ جاتا رہا

وادیٔ غربت کے ساتھی ہیں ہمیں دل سے عزیز
رو دیے ہم پھوٹ کر جب آبلہ جاتا رہا

بے خودی میں محوِ نظارہ تھے ہم کیوں چونک اٹھے
ہائے وہ اپنا مزے کا مشغلہ جاتا رہا

کیا مہذب بن کے پیشِ یار بیٹھے ہیں جلیلؔ
آج وہ جوشِ جنوں وہ ولولہ جاتا رہا

عشق اب میری جان ہے گویا
جان اب مہمان ہے گویا

جس کو دیکھو وہی ہے گرم تلاش
کہیں اس کا نشان ہے گویا

ہے قیامت اٹھان ظالم کی
وہ ابھی سے جوان ہے گویا

مانگے جائیں گے تجھ کو ہم تجھ سے
منہ میں جب تک زبان ہے گویا

جی بہلنے کو لوگ سنتے ہیں
دردِ دل داستان ہے گویا

دل میں کیسے وہ بے تکلف ہیں
ان کا اپنا مکان ہے گویا

ہائے اس عالم آشنا کی نظر
ہر نظر میں جہان ہے گویا

اچھے اچھوں کو پھانس رکھا ہے
زال دنیا جوان ہے گویا

اس سخن کا جلیل کیا کہنا
مصحفی کی زبان ہے گویا

پروا نہیں اگر دلِ شیدا نہیں رہا
ہاں غم یہ ہے کہ غم کا سٹھکانا نہیں رہا

دل سرد ہوگیا مگر ارماں نہ کم ہوئے
میلا وہی ہے گرچہ تماشا نہیں رہا

دیوانگی بھلی تھی جو محرم بنا گئی
ہم سے کسی حسین کو پردا نہیں رہا

دستِ جنوں اگر ہیں سلامت تو ایک دن
سُن لیجیے گا دامنِ صحرا نہیں رہا

چہرے سے وہ نقاب اٹھاتے نہیں کبھی
کہتے ہیں کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

کون اس کو دیکھ سکتا ہے موسیٰ کو دیکھیے
پردے سے بھی سوا ہے جو پردا نہیں رہا

سنبل کے بال بکھرے گلوں کے پھٹے لباس
کس کس کو تیرے دور میں سودا نہیں رہا

چلمن سے تاک جھانک جو ہوتی رہی یونہیں
اک دن یہ دیکھ لیں گے کہ پردا نہیں رہا

قدرِ کمال کی تجھے امید ہے جلیلؔ
وہ دن نہیں رہے وہ زمانا نہیں رہا

رونا ہے اب یہ آٹھ پہر یار کیا ہوا
آنکھوں کو روگ لگ گیا دیدار کیا ہوا

افشاں رہی جبیں پہ نہ لب پر مسی رہی
کہتے ہیں یہ تو لوٹ ہوئی پیار کیا ہوا

دیوانہ نازکی کا ہوں ہلکا سا طوق ہو
اترا ہوا گلے کا ترے ہار کیا ہوا

بازار چڑھ کے تلنے لگا ہر نگاہ میں
یوسف ہی بن گیا وہ طرحدار کیا ہوا

کیا بے گناہ جو کہا اس نے حشر میں
میرا جلیل نام گنہ گار کیا ہوا

دل میں اب تک وہی وحشت کا اثر ہے کہ جو تھا
دامن کوہ و بیاباں مرا گھر ہے کہ جو تھا

ہجر میں مشق تصور نے عجب کام کیا
میں سمجھتا ہوں وہی پیشِ نظر ہے کہ جو تھا

میں کہاں اور کہاں جلوہ فروزی ان کی
اللہ اللہ یہ میرا وہی گھر ہے کہ جو تھا

کیا قیامت تھا وہ جلوہ کہ زمانا گزرا
وہی ہنگامہ سرِ راہ گزر ہے کہ جو تھا

آپ دیکھیں تو ذرا ایک نظر حال جلیل
یہ وہی آپ کا منظور نظر ہے کہ جو تھا

اپنی بیتابی کا ہر روز اِک نیا عالم ہوا
درد دل کچھ بڑھ گیا دردِ جگر جب کم ہوا

ہر ادا میں ایک جدت ہر نگہ میں تازہ حسن
بن سنور کر آپ جب نکلے نیا عالم ہوا

جو کبھی رنگِ حنا کا بار اٹھا سکتے نہ تھے
ہائے ان ہاتھوں سے کیوں کر غیر کا ماتم ہوا

چرخ کی انجم سے زینت گل سے فرشِ خاک کی
حسن جس عالم میں پہنچا اور ہی عالم ہوا

اب غزل کہہ کہہ کے شہرت چاہتے ہو کیا جلیلؔ
عشق اب ہاتھوں سے یہ جو کچھ ہوا کیا کم ہوا

دلِ پُر داغ کو زلفوں سے نکلتے دیکھا
ہم نے ان کانوں کو طاؤس اگلتے دیکھا

نہیں معلوم بدلنے پہ ہے قسمت کس کی
آج بے وقت انھیں پوشاک بدلتے دیکھا

ڈھل کے شانے سے دوپٹا جو رکا سینے پر
بولے وہ مجھ سے کہ گرتے کو سنبھلتے دیکھا

دل کبھی لاکھ خوشامد پہ بھی راضی نہ ہوا
کبھی اک جھوٹے ہی وعدے پہ بہلتے دیکھا

حشر گھبرا کے اٹھا پاؤں کی آہٹ پہ جلیل
فتنے دوڑے جو انھیں گھر سے نکلتے دیکھا

میں خوش ہوں کہ دل کاکلِ پیچاں سے نکالا
یوسف کو مرے آپ نے زنداں سے نکالا

یہ رعب تھا ان کا کہ رہے باغ میں جب تک
غنچوں نے سر اپنا نہ گریباں سے نکالا

ہر حسن کا انداز جدا رنگ جدا ہے
مضمون یہ ہم نے گل و ریحاں سے نکالا

کیا جانے کیا اہلِ گلستاں کو کھٹک تھی
کانٹے کی طرح جانیے گلستاں سے نکالا

بس شانِ کریمی کو جلیل آپ نے دیکھا
کیا پاک مجھے حشر کے میداں سے نکالا

سیر کا لطف خیالِ گل و گلشن میں رہا
میں قفس میں بھی رہا یوں کہ نشیمن میں رہا

چاک دانائی یوسف تو کوئی بات نہیں
ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا

صبح ہوتے ہی ہوا جامہ دری میں مصروف
ہائے وہ ہاتھ جو شب بھر تری گردن میں رہا

پھول بن کر مرے اشعار بٹے یاروں میں
داغ بن کر مرا مضموں دلِ دشمن میں رہا

بن گیا آئینۂ شاہدِ مقصود جلیل
دل روشن جو خیالِ رخِ روشن میں رہا

ہمارا دل وہ گل ہے جس کو زلفِ یار میں دیکھا
جو زلفیں ہو گئیں برہم گلے کے ہار میں دیکھا

بھلا گل کیا ترا ہمسر ہو جس کی یہ حقیقت ہے
ابھی گلشن میں دیکھا تھا ابھی بازار میں دیکھا

بصیرت جب ہوئی پیدا ہمیں مشقِ تصور سے
جو کچھ خلوت میں دیکھا تھا وہی بازار میں دیکھا

چمن میں اک بتِ نازک ادا محوِ تماشا ہے
نیا گل آج ہم نے دامنِ گلزار میں دیکھا

جلیلؔ اک ناز کی قیمت دل و جاں دین و ایماں ہے
عجب انداز ہم نے حسن کے بازار میں دیکھا

خط چاند سے چہرے پہ عیاں ہو نہیں سکتا
شعلے سے پٹ جائے دھواں ہو نہیں سکتا

ہونے دو اگر ضعف سے آنکھوں میں سبک ہوں
خوش ہوں میں کسی دل پہ گراں ہو نہیں سکتا

تصویر تری آنکھ سے کیا جائے نکل کر
نازک ہے بہت نقلِ مکاں ہو نہیں سکتا

اس آگ کو درکار ہے تلوار کا پانی
رونے سے تو کم سوزِ نہاں ہو نہیں سکتا

فرما گئے وہ دے کے مجھے داغِ جدائی
یہ پھول کبھی نذرِ خزاں ہو نہیں سکتا

حق یہ ہے کہ دیدار کو درکار ہیں آنکھیں
ہونے کو ترا جلوہ کہاں ہو نہیں سکتا

تدبیر سے فطرت کا بدلنا نہیں ممکن
وہ آفتِ جاں راحتِ جاں ہو نہیں سکتا

زاہد سے کہو خدمتِ مے چاہیے برسوں
دو دن میں کوئی پیرِ مغاں ہو نہیں سکتا

کہتا ہے جلیل اب تو یہ اندازِ خموشی
حال آپ کا محتاجِ بیاں ہو نہیں سکتا

سخت نازک مزاجِ دلبر تھا
خیر گزری کہ دل بھی پتھر تھا

مختصر حالِ زندگی یہ ہے
لاکھ سودا تھا اور اک سر تھا

ان کی رُخصت کا دن تو یاد نہیں
یہ سمجھیے کہ روزِ محشر تھا

خاک بنتی مری ترے دل میں
ایک شیشہ تھا ایک پتھر تھا

تم مرے گھر جو آنے والے تھے
کھولے آغوش صبح تک در تھا

ابرِ رحمت جو ہو گیا مشہور
کِسی مے کشی کا دامن تر تھا

جب انھیں شوق تھا سنورنے کا
ایک اِک آئینہ سکندر تھا

آنسوؤں کی تھی کیا بساط مگر
دیکھتے دیکھتے سمندر تھا

کیسی آزاد زندگی ہے جلیلؔ
درِ دل پر جب اپنا بستر تھا

مرے جذبِ دل کا اثر دیکھ لینا
تم آؤ گے تھامے جگر دیکھ لینا

انھیں تن کے سینے کا عالم دکھانا
مجھے ڈر ہے ان کی کمر دیکھ لینا

نشانہ بناؤ گے تم کیا مدد کو
ہمیں ہوں گے مدِ نظر دیکھ لینا

مزے لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں
انھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا

کسی کو جلا کر نہ اے شمع خوش ہو
جو کچھ ہوگا وقتِ سحر دیکھ لینا

جو فرصت ملے آئینہ دیکھنے سے
مرا حال بھی اک نظر دیکھ لینا

عبادت کہو دل کی تسکین سمجھو
شبِ اس کی شام و سحر دیکھ لینا

دکھانا مرا نامۂ شوق قاصد
مگر پہلے ان کی نظر دیکھ لینا

ادھر سے ہیں تیر نظر چلنے والے
جلیں آج اپنا جگر دیکھ لینا

کوئی حسیں ہو مجھے اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے چپکے سے آہ کر لینا

رہے بچاؤ کا پہلو بھی قتل کرنے میں
ہماری آنکھ سے بھی اک نگاہ کر لینا

وہ ہم سے بزم میں اظہارِ شرمِ الفت کا
وہ ہم کو دیکھ کے نیچی نگاہ کر لینا

کوئی سنے نہ سنے مجھ سے دردِ دل کہنا
اثر کرے نہ کرے مجھ کو آہ کر لینا

ہمارے بعد رہے پاسِ رازِ الفت کا
کہیں نہ حال تم اپنا تباہ کر لینا

تم اپنے سینہ و بازو کو شوق سے دیکھو
ہمارے حال پہ بھی اِک نگاہ کر لینا

تم آئینے میں کرو سیر اپنے جوبن کی
ہماری آنکھ سے بھی اِک نگاہ کر لینا

ستم ہے ان کے لیے جو نباہ کرتے ہیں
تمھیں تو کھیل ہے دو دن کی چاہ کر لینا

وہ جس سے ملتے ہیں اس سے ضرور کہتے ہیں
جلیل سے نہ کہیں رسم و راہ کر لینا

دردِ دل کہہ کے انفعال ہوا
کچھ اُسے کچھ مجھے ملال ہوا

ایک بجلی نظر میں کوند گئی
خاک نظارۂ جمال ہوا

یہی دو ہیں مکانِ دل کے مکیں
تو ہوا یا ترا خیال ہوا

ہنسنے آئے تھے میرے رونے پر
آج دونوں کا ایک حال ہوا

بے غرض جان کر وہ ملتے تھے
ہائے کیوں طالبِ وصال ہوا

جو نہ کرنا تھا عاشق نے کیا
جو نہ ہونا تھا اپنا حال ہوا

دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں
آج کیا آپ کو خیال ہوا

ہجر تھا نام زندگانی کا
وصل ہوتے ہی یاں وصال ہوا

جب سنا بزم میں کلام جلیلؔ
صوفیوں کا عجیب حال ہوا

ناداں تھے وہ شباب نے ہشیار کر دیا
فتنے کو خوابِ ناز سے بیدار کر دیا

نرگس کو بھی فراق میں رونا اسی کا ہے
آنکھوں کو انتظار نے بیمار کر دیا

صورت تو ابتدا سے تری لاجواب تھی
ناز و ادا نے اور طرحدار کر دیا

جینے کی تو امید کہاں تھی فراق میں
مرنا بھی انتظار نے دشوار کر دیا

اچھے تم آئے دیکھنے اپنے مریض کو
آنکھیں دکھا کے اور بھی بیمار کر دیا

بوٹا سا قد ہے پھول سا رُخ غنچہ سا دہن
جس گھر میں وہ گئے اسے گلزار کر دیا

پیارا مجھے ہو کوئی گوارا نہیں انھیں
یاں تک کہ اپنی جان سے بیزار کر دیا

مشتاق تو کیا تھا ترے حُسن نے مگر
پردے نے اور طالبِ دیدار کر دیا

ہم سے جلیلؔ فکرِ سخن خاک ہو سکے
غم نے دل و دماغ کو بیکار کر دیا

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

ترے خیال میں جو آئے اس سے کہہ دینا
مری سمجھ میں تو کچھ نامہ بر نہیں آتا

نقاب پھونک کے کہتی ہے اک برقِ جمال
نظر کرے کوئی ایسا نظر نہیں آتا

چمن میں رونق ہے شبنم تو پھول ہنستے ہیں
تجھے تو یہ بھی مری چشمِ تر نہیں آتا

نہ پوچھیے کہ جنوں لے گیا کہاں مجھ کو
ادھر کہ ہوش جدھر بھول کر نہیں آتا

اب آپ شربتِ دیدار اپنا رکھ چھوڑیں
مریضِ ہجر تو بچتا نظر نہیں آتا

لکھا ہے نخلِ تمنا کی پتی پتی پر
یہ وہ نہال ہے جس میں ثمر نہیں آتا

کچھ اپنے محوِ تصور کی بھی خبر ہے تجھے
غریب ہوش میں دو دو پہر نہیں آتا

ہزار نکتۂ باریک تر زمو اینجاست
جلیل شعر کا فن عمر بھر نہیں آتا

ہائے دم بھر بھی دل ٹھہر نہ سکا
ہاتھ سینے پہ کوئی دھر نہ سکا

آئینہ کس سے دیکھا جاتا ہے
رشک کے مارے وہ سنور نہ سکا

رہ گیا آنکھ میں نزاکت سے
دل میں نقشہ ترا اُتر نہ سکا

وسعتِ ظرف سے رہا محروم
جام میرا کسی سے بھر نہ سکا

اُس جہاں سے گزر گئے لاکھوں
اُس گلی سے کوئی گزر نہ سکا

مے کشی سے نجات مشکل ہے
مے کا ڈوبا کبھی اُبھر نہ سکا

اشک جاری تھے یادِ گیسو میں
رات بھر قافلہ ٹھہر نہ سکا

موسمِ گل میں بھی جلیلؔ افسوس
دامن اپنا گلوں سے بھر نہ سکا

پردہ نہ تھا وہ صرف نظر کا قصور تھا
دیکھا تو ذرّہ ذرّہ میں اس کا ظہور تھا

تھی عشق و عاشقی کے لیے شرطِ زندگی
مرنے کے واسطے مجھے جینا ضرور تھا

تھا پیچھے پیچھے اہلِ عدم کے مرا غبار
میں ساتھ کارواں کے تھا ہاں دور دور تھا

اس کے کرم نے بھر دیے جنت میں بے حساب
سو تھے قصوروار تو اک بے قصور تھا

موجِ ہوا حباب کو سنگِ گراں ہوئی
لیتے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا

روزِ ازل پیا تھا جو جامِ مئے الست
آنکھوں میں مرتے مرتے اسی کا سرور تھا

دل میں چھپائے رکھتے کہاں تک بتوں کو ہم
منہ ایک دن خدا کو دکھانا ضرور تھا

محفل میں گرتے گرتے وہ مجھ پر سنبھل گئے
نشے میں چور تھے مگر اتنا شعور تھا

وہ بیخودی کی آڑ میں لپٹے جلیلؔ سے
کیوں کر کہوں کہ ہوش نہ تھا، تھا، ضرور تھا

مجھ کو بدنام آپ کو رسوا کیا
دل کی بیتابی نے جو چاہا کیا

میری وحشت بھی تماشا ہو گئی
جو ادھر گزرا کھڑا دیکھا گیا

دل سے میلا لگ گیا بازار میں
جو حسیں گزرا کھڑا دیکھا کیا

اس کو یادِ غیر مجھ کو رشکِ غیر
وہ ادھر اور میں ادھر تڑپا کیا

پھوڑ دوں کمبخت آئینہ کی آنکھ
سامنے میرے تجھے گھورا کیا

مجھ سے چھپ کر میرے گھر مہماں ہوئے
دل میں آ کر آنکھ سے پردا کیا

اس ادا سے وہ چلے مستانہ چال
سایہ گھڑیوں خاک پر لوٹا کیا

وہ ہوئے روپوش تو ان کا خیال
خواب بن کر آنکھ میں آیا کیا

دیکھ کر ان کو یہ دن دیکھا جلیلؔ
ہائے شوقِ دید نے اندھا کیا

دستِ نازک سے وہاں خنجر نکل کر رہ گیا
آج مشتاقِ شہادت ہاتھ مل کر رہ گیا

دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنا چاہیئے
کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا

درد والے کود پڑتے ہیں پرائی آگ میں
تو جو اٹھی شمع سے پروانہ جل کر رہ گیا

دیکھ کر متوالی آنکھیں پاؤں اٹھتے ہی نہیں
بارہا ساغر بھی اس محفل میں چل کر رہ گیا

امتحاں وہ کر چکے سینے پہ میرے رکھ کے ہاتھ
دردِ دل جاتا کہاں پہلو بدل کر رہ گیا

ہے جوانی ہیں نہ وہ آنکھیں نہ وہ ان کا مزاج
کیا زمانہ ہے زمانہ ہی بدل کر رہ گیا

سچ تو یہ ہے آگ ہوتی ہے رقابت کی بری
تجھ کو کسی نے جو دیکھا طور جل کر رہ گیا

یار سے جب تک نہ ہو ملنا تبھی تک خیر ہے
شمع سے پروانہ پیس اور جل کر رہ گیا

جلن بلا معشوق کوئی ہاتھ آئے گا جلیل
بے خود دل آج پہلو میں مچل کر رہ گیا

میری وحشت کا جو افسانہ بنایا ہوتا
سننے والوں کو بھی دیوانہ بنایا ہوتا

ان کے لانے کی نہ سوجھی تجھے قاصد تدبیر
جھوٹ سچ کوئی تو افسانہ بنایا ہوتا

دیکھتے تم کہ سنور جاتے نہ گیسو کیسے
میری پلکوں کا اگر شانہ بنایا ہوتا

مر کے بھی روح نہ پینے کو ترستی ساقی
میری مٹی سے جو پیمانہ بنایا ہوتا

تم نے زلفوں کو بنا کر ہمیں دیوانہ کیا
کیا بگڑتا تھا تمھارا نہ بنایا ہوتا

دل جو واعظ کا بنایا تھا الٰہی پتھر
کاش سنگِ درِ مے خانہ بنایا ہوتا

دلِ وحشی جو چھٹا مجھ سے بہت خوب ہوا
ورنہ اب تک مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

وسعتِ دل جو کوئی پیرِ مغاں دکھلاتا
ایک اک جام کو مے خانہ بنایا ہوتا

منہ سے آنچل جو ہٹاتا وہ سرِ بزم جلیل
بہ خدا شمع کو پروانہ بنایا ہوتا

تو جو میری لاش پر سایہ فگن ہو جائے گا
اے مرے قاتل وہی میرا کفن ہو جائے گا

ہم نہ سمجھے تھے کہ اے صیاد تیرے دور میں
سب قفس بھر جائیں گے خالی چمن ہو جائے گا

پردہ پوشی کے رہیں محتاج کیوں تیرے شہید
خون کی چادر جو پھیلے گی کفن ہو جائے گا

آپ چھو دیکھیں کسی غنچے کو اپنے ہاتھ سے
غنچہ گل ہو جائے گا اور گل چمن ہو جائے گا

دشتِ غربت میں روش اپنی ہے مثلِ نقشِ پا
جس جگہ ہم بیٹھ جائیں گے وطن ہو جائے گا

رنجشِ خاطر چھپاؤ لاکھ چھپنے کی نہیں
پیچ جو دل میں ہے ماتھے کی شکن ہو جائے گا

کیا غضب ہے سیرِ گلشن کو چلے ہو بے نقاب
باغباں لٹ جائے گا صدقے چمن ہو جائے گا

ہاتھ اٹھیں یا نہ اٹھیں آ گئی جس دن بہار
مثلِ گل خود پرزے پرزے پیرہن ہو جائے گا

کر چکی ہے آپ سے باہر تلاش اس کی جلیل
یہ سفر اپنا سفر اندر وطن ہو جائے گا

نظر کی چوٹ کھا کر دل اگر بے کار ہو جاتا
تو غم کیا تھا نشانے کو جگر تیار ہو جاتا

ترے جلوے سے غش آنا نہیں موقوف موسیٰ پر
یہ وہ مے ہے کہ جو پیتا وہی سرشار ہو جاتا

نکلنے کے لیے ارماں مرے دل میں مچلتے ہیں
مزہ ہوتا جو کوئی تیر دل کے پار ہو جاتا

مسرت وصل کی آنے نہ دیتی ہوش میں مجھ کو
جو تو ملتا تو پھر ملنا مرا دشوار ہو جاتا

چمن سے توڑ کر گل لے گیا بولی نہ کچھ بلبل
جو میں ہوتا تو گلچیں کے گلے کا ہار ہو جاتا

یہاں تو ہے غرض اس سے کہ ملنے کا سہارا ہے
وہ ملتے یا نہ ملتے وصل کا اقرار ہو جاتا

محیطِ غم میں اے قاتل مری کشتی ہے طوفانی
لگا دیتا جو تو اک ہاتھ بیڑا پار ہو جاتا

جھلک پردے کی تھی جس نے اڑائے ہوش موسیٰ کے
نہیں معلوم کیا ہوتا اگر دیدار ہو جاتا

جلیلؔ اک بے وفا کی یاد دل میں گدگداتی ہے
وگرنہ شعر کہنا آج کل دشوار ہو جاتا

ستم ہے مبتلائے عشق ہو جانا جواں ہو کر
ہمارے باغِ ہستی میں بہار آئی خزاں ہو کر

جوانی کی دعائیں مانگی جاتی تھیں لڑکپن میں
لڑکپن کے مزے اب یاد آتے ہیں جواں ہو کر

خدا رکھے دلِ مایوس میں امید باقی ہے
یہی گل ہے جو بو دیتا ہے پامالِ خزاں ہو کر

مجھے شبنم بنا رکھا ہے ان خورشید رویوں نے
رُلاتے ہیں نہاں ہو کر مٹاتے ہیں عیاں ہو کر

ہمیں وہ تھے کہ ہوتی تھی بسر پھولوں کے غنچے میں
ہمیں اب اے فلک تنکے چنیں بے آشیاں ہو کر

درِ جاناں کے آگے کب تحیر بڑھنے دیتا ہے
جو آتا ہے وہ رہ جاتا ہے سنگِ آستاں ہو کر

نہالِ شمع میں کیا خوشنما اک پھول آیا تھا
ستم ڈھایا نسیمِ صبح نے بادِ خزاں ہو کر

تقاضا سن کا بھی اللہ کیا شے ہے کہ یوسف سے
زلیخا ناز کرتی ہے نئے سر سے جواں ہو کر

جلیلؔ آخر جو کی ہے شاعری کچھ کام بھی نکلے
کسی بُت کو مسخر کیجیے معجز بیاں ہو کر

اور اتر آئیں گے وہ برقِ تجلیٰ بن کر
آرسی گھورتی ہے دیدۂ موسیٰ بن کر

گوشہ گیری میں بھی شہرت مری کچھ کم نہ ہوئی
پر نکالے مرے مضمون نے عنقا بن کر

نقشِ پا کو نہ ستم گر نے پلٹ کر دیکھا
راہ تکتے ہی رہے چشمِ تمنا بن کر

ٹوٹنا خار کا مجھ سے نہیں دیکھا جاتا
پھوٹ بہتی ہے مری آنکھ بھی چھالا بن کر

دُرِ مضموں کا ہے وہ جوش کہ اللہ اللہ
لہریں لیتی ہے طبیعت مری دریا بن کر

ان کو پردے میں بھی ہے شوق نموداری کا
آنکھوں میں رہتے ہیں وہ آنکھ کا تارا بن کر

کیا مزہ ہے اُدھر اُٹھی ہے دھواں دھار گھٹا
اِدھر آتا ہے مرا گیسوؤں والا بن کر

جتنے آئینے ہیں سب تکتے ہیں صورت میری
آئینہ خانہ میں آیا میں تماشا بن کر

بعد استاد کے ہو لطفِ سخن خاک جلیلؔ
شعر بھی منہ سے نکلتا ہے تو نالا بن کر

اچھی کہی دل میں نے لگایا ہے کہیں اور
یہ جب ہو کہ تم سا ہو زمانے میں کہیں اور

گردوں پہ مہ و مہر گل و شمع زمیں پر
اک جلوۂ جاناں ہے کہیں اور کہیں اور

میں عکس ہوں آئینۂ امکاں میں تمھارا
تم سا جو نہیں اور تو مجھ سا بھی نہیں اور

احباب جو کرتے ہیں کرم حال پہ میرے
کہتا ہے جنوں آیئے چل بیٹھیں کہیں اور

جاتے ہیں مٹاتے ہوئے وہ نقشِ قدم کو
کہ دے کوئی ان سے کہ ہے اک خاک نشیں اور

آنکھ اس نے ملائی تڑپ اٹھا دلِ مضطر
تاکا تھا کہیں اور پڑا تیر کہیں اور

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو
جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

دیتی ہے مزہ ناصیہ سائی ترے در پر
اک سجدہ جو کرتا ہوں تو کہتی ہے جبیں اور

کچھ روز جلیلؔ اپنی یہی گر یہی حالت
ڈھونڈیں گے فلک اور نکالیں گے زمیں اور

چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہو کر
مجھے مار ڈالا مری جان ہو کر

یہ صورت ہوئی ہے کہ آئینہ پھر وں
مرے منہ کو تکتا ہے حیران ہو کر

جواں ہوتے ہی لے اڑا حسن تم کو
پری ہو گئے تم تو انسان ہو کر

بگڑنے میں زلفِ رسا کی بن آئی
لیے رُخ کے بوسے پریشان ہو کر

کرم میں مزہ ہے ستم میں ادا ہے
میں راضی ہوں جو تجھ کو آسان ہو کر

جدا سر ہوا پر ہوئے ہم نہ ہلکے
رہی تیغ گردن پر احسان ہو کر

نہ آخر بچا پردۂ راز دشمن
ہوا چاک میرا گریبان ہو کر

حواس آتے جاتے رہے روز وعدہ
تری یاد ہو کر مری جان ہو کر

بتوں کو جگہ دل میں دیتے ہو توبہ
جلیل ایسی باتیں مسلمان ہو کر

سجدہ کیا ہے جب سے ترے آستان پر
دنیا کی آنکھ پڑنے لگی آسمان پر

تلووں کا خون چوس کے کانٹے نہال تھے
روتے ہیں اب کہ پڑ گئے چھالے زبان پر

تھوڑی سی بے خودی کی ہمیں بھی تلاش ہے
پوچھیں گے چل کے پیرِ مغاں کی دکان پر

اوصاف اپنے حسن کے مجھ سے نہ پوچھیے
جو دل میں ہے وہ آ نہیں سکتا زبان پر

ہم نے پیا تھا بادۂ وحدت ازل کے دن
کچھ کچھ ابھی تک اس کا مزہ ہے زبان پر

دو دن کی ہے بہارِ چمن اس پہ ناز کیا
پھولوں کو آ رہی ہے ہنسی باغبان پر

چشمِ سیاہ مست کا پلکوں میں ہے وہ رنگ
جیسے ہو بھیڑ شام کو مے کی دکان پر

جلنے کو میں بچا تو فلک کو جلن ہوئی
بجلی زمیں سے اٹھ کے گری آسمان پر

مضمون تازہ ہو کہ نہ ہو لیکن اے جلیلؔ
ایسا کہو کہ حرف نہ آئے زبان پر

اگرچہ حسن نہیں ان کا حجاب کے قابل
مگر ابھی سے ہے صورت نقاب کے قابل
وہ پڑھ چکے مرا نامہ تو نامہ بر سے کہا
جواب ہے کہ نہیں ہے جواب کے قابل

اب آؤ رکھ لوں چھپا کر تمھیں کلیجے میں
ہوئے ہو خیر سے شرم و حجاب کے قابل

کوئی حسین بھی اے کاش چلبلا ملتا
ملا تھا دل جو ہمیں اضطراب کے قابل

ہزار روپ نکالا عروس دنیا نے
مگر سدا یہ رہی اجتناب کے قابل
جواب صاف دیا آپ نے دیا تو سہی
مرا سوال تو ٹھہرا جواب کے قابل

سکوت سے دلِ امیدوار ٹوٹ گیا
مرا سوال نہ تھا اس جواب کے قابل

تھکا ہوا ہوں نکیرین سے کہو دم لیں
ابھی نہیں میں سوال و جواب کے قابل

جلیلؔ شعر وہی انتخاب ہوتا ہے
کہے جو آپ کہ ہوں انتخاب کے قابل

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں

خط تو ہم لکھ بھی چکے جا بھی چکا قاصد کے ہاتھ
کچھ زبانی تجھ سے اے بادِ صبا کہنے کو ہیں

کون روکے کون ٹوکے دیدۂ پُر جوش کو
یہ بھری محفل میں رازِ دل مرا کہنے کو ہیں

سننے والے سے جو ہے حسنِ سماعت کی امید
اپنا اپنا حال سب روزِ جزا کہنے کو ہیں

میرا مرنا سُن کے آئے ہیں شکایت کے لیے
لاش پر غم گیں کھڑے ہیں بے وفا کہنے کو ہیں

آبلوں نے جو اٹھائی ہے اذیت دشت میں
سب زبانِ خار سے وہ ماجرا کہنے کو ہیں

جتنے آئے آئے تنہا جو گیا تنہا گیا
کون کس کا آشنا ہے آشنا کہنے کو ہیں

بس بس اے چشم سخن گو سحر سازی ہو گئی
دیکھ اب کچھ وہ لب معجز نما کہنے کو ہیں

ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیلؔ
جان دیتے ہیں بتوں پر یا خدا کہنے کو ہیں

پوچھوں گا پھر بہار چمن کی خبر کو میں
پہلے گلے لگالوں نسیمِ سحر کو میں

اچھا نہیں کہ ہو رخِ محبوب بے نقاب
پردہ اُٹھے تو ڈال دوں اپنی نظر کو میں

بےخود کرے نہ وصل کی لذت محال ہے
تم شام کو ملے تو ملوں گا سحر کو میں

دل داغ دار رات اندھیری۔ جنوں کا زور
لے کر چراغ ڈھونڈ رہا ہوں سحر کو میں

شاید ابھی وہ دیکھ کے آئے ہیں آئینہ
کہتے ہیں مانتا ہوں تمھاری نظر کو میں

جاناہی جب تمھیں ہے تو رُکنے سے فائدہ
ہاں اس قدر کہ تھام لوں اپنے جگر کو میں

سوتے میں کُھل گئی ہے جو وہ زلف مشک بو
کیا کیا ملا رہا ہوں نسیمِ سحر کو میں

اک شمع ہے مزار پہ وہ بھی بجھی ہوئی
کیا دیکھ کر بلاؤں نسیم سحر کو میں

پوچھیں گے حال میرا سب اہلِ چمن جلیلؔ
تھوڑی سی خاک دے دوں نسیم سحر کو میں

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

گنہ گنہ نہ رہا اتنی بادہ نوشی کی
اب ایک شغل ہے کچھ لذّتِ شراب نہیں

ہمیں تو دور سے آنکھیں دکھائی جاتی ہیں
نقاب پٹی ہے اس پر کوئی عتاب نہیں

پیے بغیر چڑھی رہتی ہے حسینوں کو
وہاں شباب ہے کیا کم اگر شراب نہیں

بہار دیتا ہے چمن چمن کے نور چہرے کا
سرِ نقاب ہے جو کچھ تہ نقاب نہیں

وہ اپنے عکس کو آواز دے کے کہتے ہیں
ترا جواب تو میں ہوں مرا جواب نہیں

اسے بھی آپ کے ہونٹوں کا پڑ گیا چسکا
ہزار چھوڑیے چھٹنے کی اب شراب نہیں

بتوں سے پردہ اٹھانے کی بحث ہے بے کار
کھلی دلیل ہے کعبہ بھی بے نقاب نہیں

جلیل ختم نہ ہو دورِ جام مینائی
کہ اس شراب سے بڑھ کر کوئی شراب نہیں

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں

واعظو چھیڑو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیے بیٹھے ہیں

دل کو ہم ڈھونڈتے ہیں چار طرف
اور یہاں آپ لیے بیٹھے ہیں

گوشے آنچل کے ترے سینے پر
ہائے کیا چیز لیے بیٹھے ہیں

دشتِ وحشت کو خبر کر دے کوئی
ہم گریبان سیے بیٹھے ہیں

آپ کے ناز اٹھانے والے
جان کو صبر کیے بیٹھے ہیں

ہائے پوچھو نہ تصور کے مزے
گود میں تم کو لیے بیٹھے ہیں

اور کیا چاہتے ہو ان سے جلیلؔ
ہاتھ میں ہاتھ دیے بیٹھے ہیں

دشمنوں پر نگہِ لطف و کرم ہے کہ نہیں
تمھیں انصاف سے کہہ دو یہ ستم ہے کہ نہیں

میں تو سنتا ہوں تمھیں بھی ہے محبت مجھ سے
سچ کہو تم کو مرے سر کی قسم ہے کہ نہیں

خوش خرامی سے انھیں کام، خبر کیا اس کی
کسی پامال کا دل زیرِ قدم ہے کہ نہیں

کیا کہوں کیا مری حالت ہوئی سُن کر یہ پیام
کچھ تمھیں میری جُدائی کا بھی غم ہے کہ نہیں

آکے بالیں پہ مرے ہائے کسی کا کہنا
دیکھنا کچھ مرے بیمار میں دم ہے کہ نہیں

ہم کو تو جان دیے ایک زمانہ گزرا
اب خدا جانے انھیں مشقِ ستم ہے کہ نہیں

اور تھا کون جو کرتا مری تربت پامال
دیکھیے آپ ہی کا نقشِ قدم ہے کہ نہیں

فکر رہتی ہے شب و روز حسینوں کی جلیل
کچھ تمھیں مردِ خدا اور بھی غم ہے کہ نہیں

دیدۂ منتظر میں خواب نہیں
کورے دو جام ہیں شراب نہیں

قاصد آیا مگر جواب نہیں
میرے لکھے کا بھی جواب نہیں

نور وہ ہے کہ کچھ نہیں کھلتا
ہے ترے رُخ پہ یا نقاب نہیں

صبح ہوتے وہ گھر گئے اپنے
اب نکلنے کا آفتاب نہیں

مے تو ڈھل کر رہے گی اے ساقی
کچھ یہ معشوق کا شباب نہیں

ہو کے بے سایہ سایہ افگن ہے
آپ کے قد کا بھی جواب نہیں

آہ کو سن کے منہ چھپاتے ہو
ایک جھونکے کی بھی نقاب نہیں

ختم ہوتی نہیں ہوس دل کی
ایک طوفان ہے شباب نہیں

خاک ہو آبرو غزل کی جلیل
تیرے ان موتیوں میں آب نہیں

جو دل کو کھو چکے ہیں وہ دل کو ڈھونڈتے ہیں
ہم دل سے تنگ آکر قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

کیا دھن ہے جستجو کی یہ بھی خبر نہیں ہے
دل بر کو ڈھونڈتے ہیں یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

جو زخم دے چکے ہیں جی لینے کو ہیں کافی
اب کس لیے وہ اپنے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اللہ رے عشق لیلیٰ مجنوں کے بن میں اب تک
اٹھتے ہیں جو بگولے محمل کو ڈھونڈتے ہیں

راہِ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا
منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

کاٹے نہیں جو کٹتے فرقت میں دن ہمارے
خنجر کی جستجو میں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اُلجھے ہوئے وہ گیسو ہیں کس قدر پریشاں
جب سے یہ سن لیا ہے ہم دل کو ڈھونڈتے ہیں

تم نے جو اپنے رُخ سے پردہ اٹھا دیا ہے
تارے فلک پہ ماہِ کامل کو ڈھونڈتے ہیں

بے تیر و بے کماں کے جو دل شکار کر لے
ہم تو جلیلؔ ایسے قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

تڑپتے لوٹتے ہیں نالہ و فریاد کرتے ہیں
ہم اپنے بھولنے والے کو یوں ہی یاد کرتے ہیں

اسیری کی ہوا کیا رہنے دے گی باغ میں ہم کو
کئی دن سے تلاشِ خانۂ صیاد کرتے ہیں

تمھاری بے وفائی، ہم نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے
دیا ہے وہ سبق تم نے کہ اکثر یاد کرتے ہیں

ذرا ملنا، ذرا کھنچنا، ذرا نرمی، ذرا گرمی
مزے لے لے کے وہ عشاق پر بے داد کرتے ہیں

کسے صدمہ نہیں رنگِ چمن کی بے ثباتی کا
چٹکتے ہیں جو غنچے اصل میں فریاد کرتے ہیں

ہماری بے خودی کا حال وہ پوچھیں تو اے قاصد
یہ کہنا ہوش اتنا ہے کہ تم کو یاد کرتے ہیں

بنے معشوق جس دن سے کبھی فرصت نہیں ہوتی
ستم پر وہ ستم بے داد پر بے داد کرتے ہیں

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

ہستی ہے عدم مری نظر میں
سوجھی ہے یہ ایک عمر بھر میں

او آنکھ چُرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

پھیلاتی ہے پاؤں حسرت دید
ٹھنڈک جو ملی ہے چشم تر میں

کوئی نہ حجاب کام آیا
دیکھا تو وہ تھے مری نظر میں

کم ظرف تھے سارے غنچہ و گل
کیا پھولے ہیں ایک مشتِ زر میں

اتنا بھی نہ ہو کوئی حیادار
دیکھا تو سما گئے نظر میں

تارے یہ نہیں ہیں آخرِ شب
کچھ پھول ہیں دامن سحر میں

ہے عمر رواں کا شمع میں رنگ
گھر بیٹھے گزرتی ہے سفر میں

دنیا ہے جلیلؔ ہاتھ اٹھائے
بیٹھے ہیں کسی کی رہ گزر میں

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

ابھی کل تک تھے کیسے بھولے بھالے
ذرا اُبھرے ہیں آفت ڈھا رہے ہیں

کہا اس نے سوال وصل سن کر
کہ مجھ سے آپ کچھ فرما رہے ہیں

وہ بجلی ہیں تو ہوں ان کو مبارک
مجھے کس واسطے تڑپا رہے ہیں

مجھے تو انتظار چارہ گر ہے
الٰہی غش پہ غش کیوں آ رہے ہیں

رہے دامن بھرا ان کا ہمیشہ
لحد پر پھول جو برسا رہے ہیں

سنا کر قصۂ پروانہ و شمع
ہمارے دل کو وہ گرما رہے ہیں

دو روزہ حسن پر پھولے ہیں کیا گل
بڑے کم ظرف ہیں اترا رہے ہیں

کبھی ہم نے پیا تھا بادۂ عشق
جلیلؔ اس کے مزے اب آ رہے ہیں

دیکھا ہے وہ جمال بُتِ خوش جمال میں
آئے قیاس میں نہ کسی کے خیال میں

آنکھوں پہ رکھ کے اشک بار جو میں اشک بار ہوں
موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں

خالی ہے جام بھر دے شراب اس میں ساقیا
رکھ دے اس آفتاب کو طاقِ ہلال میں

ہے کم سنی کی قید میں عالم شباب کا
کیا سیر ہے کہ بدر چھپا ہے ہلال میں

فکرِ سخن میں ہو گئے کچھ ایسے ناتواں
آتے نہیں جلیل خود اپنے خیال میں

کون کہتا ہے کہ شرمیلی ادا اچھی نہیں
ہے بہت اچھی مگر ہم سے حیا اچھی نہیں

آپ کو جلوہ دکھانا ہو تو باہر آئیے
لن ترانی کی یہ در پردہ صدا اچھی نہیں

آئینہ کیا اس کو سمجھے گا یہ ہم سے پوچھیے
کونسی اچھی ادا ہے کون ادا اچھی نہیں

آپ نے تصویر بھیجی میں نے دیکھی غور سے
ہر ادا اچھی خموشی کی ادا اچھی نہیں

ہاتھ میں سبحہ بتوں کی آرزو دل میں جلیلؔ
اس طرح یادِ خدا مردِ خدا اچھی نہیں

عجیب حسن ہے ان سُرخ سرخ گالوں میں
مئے دو آتشہ بھر دی ہے دو پیالوں میں

سُنیں جو آپ تو سونا حرام ہو جائے
تمام رات گزرتی ہے جن خیالوں میں

امید و یاس نے جھگڑے میں ڈال رکھا ہے
نہ جینے والوں میں ہم ہیں نہ مرنے والوں میں

چمن میں گل بھی حنا بھی مگر نصیب کی بات
کوئی تو سر چڑھے کوئی ہو پائمالوں میں

نسیم شمع لحد کو ذرا بچائے ہوئے
یہی ہے ایک غریبوں کے رونے والوں میں

یہاں خزاں کا نہ کھٹکا نہ خوف گل چیں کا
بہار گل میں رہے یا تمھارے گالوں میں

نہیں ہے لطف کہ خلوت میں غیر شامل ہو
اٹھا دو شمع کو یہ بھی ہے جلنے والوں میں

چھپے گا کیا دلِ پرخوں کا راز آنکھوں سے
جو ہوگا شیشے میں آئے گا وہ پیالوں میں

ہزار شکر کہ ہم نقص میں ہوئے کامل
جلیل رہ گئی بات اپنی ذی کمالوں میں

تڑپنے پر مرے منہ پھیر کر آنسو بہاتے ہیں
تنفر کا بھی ہے اظہار چاہت بھی جتاتے ہیں

دلِ پُر داغ کو یوں ملنگتے شرم ان کو آتی ہے
چمن سے توڑ کر اک پھول لالے کا دکھاتے ہیں

بڑے ہمدرد بن کر آئے ہیں اللہ رے ہمدردی
مرے دم پر بنی ہے آپ بیٹھے مسکراتے ہیں

کسی دن تم نے رکھا تھا حنائی ہاتھ سینے پر
خدا شاہد ہے ٹھنڈک آج تک ہم دل میں پاتے ہیں

پڑے کیا ہو چلبل اٹھو بڑی قسمت تمہاری ہے
جنھیں تم یاد کرتے تھے ابھی دیکھو وہ آتے ہیں

تڑپ کر جب کہا دل نے کہ پہلو سے نکلتے ہیں
تو جانِ ناتواں بولی کہ چلیئے ہم بھی چلتے ہیں

مزہ جب ہے کہ آجائے کہیں ان کی طبیعت بھی
ذرا وہ بھی تو جانیں کروٹیں کیوں کر بدلتے ہیں

جنوں کے جوش میں دامن گریباں سے یہ کہتا ہے
کہ دیکھیں تم نکلتے ہو کہ ہم پہلے نکلتے ہیں

ہمیں نے دے کے دل چالیں سکھائیں دلربائی کی
خدا کی شان یہ بت اب ہمیں سے چال چلتے ہیں

جلیلؔ احباب کی فرمایشوں سے ناک میں دم ہے
سمجھ رکھا ہے سب نے شعر بھی سانچے میں ڈھلتے ہیں

قفس میں ہوں کہ طائر آشیاں میں
ترا کرتے ہیں ذکر اپنی زباں میں

چمن یوں ہی رہے گا نذرِ صرصر
ہے اک تنکا بھی جب تک آشیاں میں

ہجومِ اشک میں ملتا نہیں دل
مرا یوسف ہے گم اس کارواں میں

مذکر اور مونث کی ہیں بحثیں
بڑا جھگڑا ہے یہ اردو زباں میں

جلیلؔ اس باغ میں کانٹے کی صورت
کھٹکتا ہے نگاہِ باغباں میں

ہزاروں جان دینے کے لیے تیار بیٹھے ہیں
مگر وہ ہیں کہ زانو پر دھرے تلوار بیٹھے ہیں

کہا جانے کو جب اس نے تو جانِ ناتواں بولی
کہ چلیے ہم بھی چلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں

کہو برقِ جمالِ یار سے ہاں دیر اب کیا ہے
جگر تھامے ہوئے سب طالبِ دیدار بیٹھے ہیں

نرالا دَور ہے یہ آپ کا دَورِ مسیحائی
ہزاروں ہیں کہ اپنی جان سے بیزار بیٹھے ہیں

جلیلؔ اب کیا کہوں تم سے اداسی بزمِ ہستی کی
ہزاروں تھے جہاں بیٹھے وہاں دو چار بیٹھے ہیں

پریشاں رخ پہ اپنے زلفِ عنبر فام کرتے ہیں
وہ مشتاقوں کی صبحِ زندگی کو شام کرتے ہیں

شباہت اس میں پاتے ہیں جو شیشے چشمِ ساقی کی
جھکا دیتے ہیں گردن احترامِ جام کرتے ہیں

نہیں حکمت سے خالی پیچ و خم شب رنگ زلفوں کے
انھیں گلیوں میں فتنے حشر کے آرام کرتے ہیں

بہار آئے چمن میں یا نہ آئے ان کو کیا پروا
وہ آئینے میں سیرِ عارضِ گل فام کرتے ہیں

جلیلؔ اس شان کے قرباں کہ اب آغازِ مے نوشی
تمھارا نام لے کر رندے آشام کرتے ہیں

مریضوں کو تسکیں ذرا دیتے جاؤ
دعا لیتے جاؤ دوا دیتے جاؤ

دیا ہے جو دل مفت سمجھو نہ اس کو
خطا میں نے کی ہے سزا دیتے جاؤ

ستم کا ہے چسکا پھر آنا پڑے گا
مجھے زندگی کی دعا دیتے جاؤ

یہ نازک سا شیشہ ہے تم دل کے پتھر
خدا کے لیے دل مرا دیتے جاؤ

گزرگاہِ خوباں میں اپنی صدا ہے
کوئی بوسہ راہِ خدا دیتے جاؤ

مرا دل تو برباد ہی کر چلے تم
کہاں اب ملو گے پتا دیتے جاؤ

ستم ہے یہ بسمل سے دامن بچانا
ذرا زخمِ دل کی ہوا دیتے جاؤ

میں کیا کہہ کے سمجھاؤں گا اپنے دل کو
زباں مجھ کو بہرِ خدا دیتے جاؤ

جلیل آ ہی جائے گا رحم اس صنم کو
تم اللہ کا واسطا دیتے جاؤ

بوئے مے پا کے میں چلتا ہوا مے خانے کو
اک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو

لے گیا جوشِ جنوں کون سے ویرانے کو
ہوش بھی ڈھونڈ رہے ہیں ترے دیوانے کو

چال ہے مست نظر مست ادا میں مستی
جیسے آتے ہیں وہ لوٹے ہوئے مے خانے کو

سختیٔ عشق اٹھانے کا زمانہ نہ رہا
اب تو ہے پھول بھی پتھر ترے دیوانے کو

توبہ کرنے پہ بھی اتنا ہے علاقہ باقی
دور سے دیکھ لیا کرتے ہیں مے خانے کو

اپنا شیدا جو کیا بندہ نوازی اس کی
ورنہ کیا شمع سے نسبت کسی پروانے کو

اس میں اے پردہ نشیں پردہ دری کس کی ہے
دیکھنے آتی ہے خلقت ترے دیوانے کو

شکوۂ دل شکنی کیجئے کیا ساقی سے
جوڑتا کون ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے کو

حرمتِ مے کدہ کہتی ہے یہ مجھ سے کہ جلیلؔ
دل سے شیشے کو لگا آنکھ سے پیمانے کو

انگڑائیاں وہ لیتے ہیں کس کس ادا کے ساتھ
اچھا سلوک کرتے ہیں شرم و حیا کے ساتھ

لیتے ہیں اپنے عکس سے تعلیم دل بری
آئینہ دیکھتے ہیں وہ کس کس ادا کے ساتھ

غمزے ہزار ہا ہیں وہاں ایک دو نہیں
کچھ شوخیوں کے ساتھ ہیں کچھ ہیں حیا کے ساتھ

تیغ رواں کی چال تو اپنی نظر میں ہے
چلنا یہ کس سے آپ نے سیکھا ادا کے ساتھ

آفت نصیب دل ہے فقط اس قصور پر
کی تھی وفا غریب نے اک بے وفا کے ساتھ

سایہ غریب خاک پہ لوٹے نہ کیا کرے
کس نے کہا تھا آپ کو چلئے ادا کے ساتھ

لب پر اِدھر ہنسی اُدھر آنکھیں جھکی ہوئیں
شوخی ہے آج دست و گریباں حیا کے ساتھ

تنہا وہ آئیں جائیں یہ ہے شان کے خلاف
آنا حیا کے ساتھ ہے جانا ادا کے ساتھ

ہم نے بہت اُٹھائے ہیں آزار اے جلیلؔ
اب دل لگائیں گے نہ کسی بے وفا کے ساتھ

ہم تو قصوروار ہوئے آنکھ ڈال کے
پوچھو کہ نکلے کیوں تھے وہ جوبن نکال کے

آنکھوں سے خواب کا ہو گزر کیا مجال ہے
پہرے بٹھا دیئے ہیں کسی کے خیال کے

دل میں وہ بھیڑ ہے کہ ذرا بھی نہیں جگہ
آپ آیئے مگر کوئی ارماں نکال کے

صد شکر وصف قد پہ وہ اتنا تو پھول اُٹھے
مضموں بلند ہیں مرے عالی خیال کے

لذت یہی کھٹک کی جو ہے راہِ عشق میں
رکھ لوں گا دل میں پاؤں کے کانٹے نکال کے

دل رہ گیا اُلجھ کے نگاہوں کے تار میں
اچھا وہ جان ڈال گئے آنکھ ڈال کے

سُنیئے تو اک ذرا مرے اشعار دردناک
لایا ہوں میں کلیجے کے ٹکڑے نکال کے

آئینہ ہے جوان کا مصاحب تو کیا ہوا
ہم بھی کبھی تھے دیکھنے والے جمال کے

لکھی ہے کھا کے خونِ جگر یہ غزل جلیل
مصرع نہیں ہیں شعر کے ٹکڑے ہیں لال کے

نہ خوشی اچھی ہے اے دل نہ ملال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

دلِ بے تاب کو پہلو میں مچلتے کیا دیر
سُن لے اتنا کسی کافر کا جمال اچھا ہے

بات اُلٹی وہ سمجھتے ہیں جو کچھ کہتا ہوں
اب کے پوچھا تو یہ کہہ دوں گا کہ حال اچھا ہے

صحبت آئینے سے بچپن میں خدا خیر کرے
وہ ابھی سے کہیں سمجھیں نہ جمال اچھا ہے

مشتری دل کا یہ کہہ کہہ کے بنایا ان کو
چیز انوکھی ہے نئی جنس ہے مال اچھا ہے

چشم و دل جس کے ہوں مشتاق وہ صورت اچھی
جس کی تعریف ہو گھر گھر وہ جمال اچھا ہے

یار تک روز پہنچتی ہے بُرائی میری
رشک ہوتا ہے کہ مجھ سے مرا حال اچھا ہے

اپنی آنکھیں نظر آتی ہیں جو اچھی ان کو
جانتے ہیں مرے بیمار کا حال اچھا ہے

باتوں باتوں میں لگا لائے حسینوں کو جلیلؔ
تم کو بھی سحر بیانی میں کمال اچھا ہے

کریم سے کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے
خطا سے پہلے ہی عفو قصور ہوتا ہے

اکیلے آپ تو خلوت میں بھی نہیں ہوتے
ادا میں ناز، نگہ میں غرور ہوتا ہے

وہ چھپ کے آتے ہیں اس طرح شب کے پردے میں
کہ جیسے آنکھ کی پتلی میں نور ہوتا ہے

مجھے بہت دلِ صد پارہ یاد آتا ہے
جو گر کے شیشہ کوئی چور چور ہوتا ہے

ہمارے ان کے برابر کی چوٹ رہتی ہے
اِدھر سے عجز اُدھر سے غرور ہوتا ہے

تم اپنے دل کو تو روشن کرو ذرا موسیٰ
یہی چمک کے ابھی برق طور ہوتا ہے

جزا سزا کا تجھے اختیار ہے یا رب
غفور جان کے تجھ کو قصور ہوتا ہے

پلٹ کے آئے گا دم بھر میں پھر نظر کی طرح
وہ کیا سمجھ کے ان آنکھوں سے دور ہوتا ہے

کچھ اہلِ درد جہاں مل کے بیٹھ جاتے ہیں
وہاں جلیل کا چرچا ضرور ہوتا ہے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

اپنی ادائے نیم نگاہی کا واسطہ
لے بے خبر کہ ترے نیم جاں چلے

اپنی رگِ گلو ہے کہ اک شاہ راہ ہے
خنجر چلے چھری چلے تیغ رواں چلے

اٹھتا ہوں میں جو وحشت سے جانے کو اے جنوں
کہتے ہیں خار تھام کے دامن کہاں چلے

آنکھوں میں آ کے کون الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

جس جا گرے وہیں کے ہوئے تیرے ناتواں
نقشِ قدم کی چال پسِ کارواں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

بحرِ جہاں کی سیر بھی ہونا ضرور ہے
آہستہ اپنی کشتیٔ عمرِ رواں چلے

ذکرِ حبیب سے نہ ہو غفلت کبھی جلیلؔ
چلتا رہے یہ کام بھی جب تک زباں چلے

ترا شباب رہے، ہم رہیں، شراب رہے
یہ دورِ عیش کا تا دورِ آفتاب رہے

پکارے کہتے ہیں اب ان کے آتشیں رخسار
کہ دامن اپنا بچائے ہوئے نقاب رہے

کسی کی راہِ شبِ وعدہ دیکھنا ہے مجھے
الگ تھلگ مری آنکھوں سے آج خواب رہے

چلا ہے گھر سے وہ مست شباب لازم ہے
قدم قدم پہ سنبھالے ہوئے حجاب رہے

نمودِ رنگِ حیا ہو چلی ہے چہرے سے
عجب نہیں ہے کہ بن کر یہی نقاب رہے

دو روزہ حسن تو لاکھوں کی جان لیتا ہے
نہ جانے کیا ہو اگر کچھ دنوں شباب رہے

یہ رند کہتے ہیں لے لے کے بے خودی کے مزے
کہ ہم رہیں نہ رہیں نشۂ شراب رہے

غضب کا نورِ رُخِ پُر ضیا سے چھنتا ہے
نقاب پر بھی ہے لازم کوئی نقاب رہے

جلیلؔ اب ہوسِ مے کہاں بقولِ امیرؔ
مزے شراب کے تا عالمِ شراب رہے

موجود تھے ابھی، ابھی روپوش ہو گئے
اے مستِ ناز تم تو مرے ہوش ہو گئے

سوتے میں وہ جو مجھ سے ہم آغوش ہو گئے
جتنے جگے تھے خوابِ فراموش ہو گئے

وعدے کی بات آئی قضا اس ادا کے ساتھ
دھوکے میں تیرے اس سے ہم آغوش ہو گئے

برسوں ہوئے نہ تم نے کیا بھول کر بھی یاد
وعدے کی طرح ہم بھی فراموش ہو گئے

آنکھوں میں بھی جو آئے تو اللہ رے حجاب
بن کر نظر نظر سے وہ روپوش ہو گئے

کیا کیا زباں دراز چراغِ انجمن میں تھے
دامن کشاں تم آئے تو خاموش ہو گئے

یارانِ رفتہ بات کا دیتے نہیں جواب
کیا کہہ دیا قضا نے کہ خاموش ہو گئے

آئی شبِ وصال تو نیند آ گئی انھیں
ہم ہوش میں جو آئے وہ مدہوش ہو گئے

مر کر تمام سر سے ٹلیں آفتیں جلیلؔ
ہم جان دے کے سب سے سبک دوش ہو گئے

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

وہ سنورتے ہیں مجھے اس کی ہے فکر
آرزو کس کی نکالی جائے گی

دل لیا پہلی نظر میں آپ نے
اب ادا کوئی نہ خالی جائے گی

آتے آتے آئے گا ان کو خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

کیا کہوں دل توڑتے ہیں کس لیے
آرزو شاید نکالی جائے گی

گرمیٔ نظارہ بازی کا ہے شوق
باغ سے نرگس نکالی جائے گی

دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ
شاید اس میں جان ڈالی جائے گی

اے تمنا تجھ کو رو لوں شام وصل
آج تو دل سے نکالی جائے گی

فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیل
اب طبیعت کچھ سنبھالی جائے گی

کالی کالی جو گھٹا چھائی ہے
زلفِ ساقی مجھے یاد آئی ہے

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
دو قدم کوچۂ رسوائی ہے

آپ اور سوگ مرا کیا کہنا
دیکھیے لب پہ ہنسی آئی ہے

گدگدا دیتی ہے دل کو ظالم
شوخ کتنی تری انگڑائی ہے

باغِ ہستی سے بہت دور تھے ہم
بو کسی گل کی لگا لائی ہے

جب سے چھوٹا ہے گلستاں ہم سے
روز سنتے ہیں بہار آئی ہے

گر کے ٹوٹا ہے جو ساغر میرا
ہائے ساقی کی صدا آئی ہے

تم پہ جس روز سے آیا ہے شباب
باغِ عالم میں بہار آئی ہے

وہ ہے پردے میں مگر پھر بھی جلیلؔ
سارے عالم سے شناسائی ہے

ناز بھی ہوتا رہا ہوتی رہے بے داد بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

ہاتھ کیا آتا کہ میں تھا طائرِ رنگِ حنا
باغباں بھی تاک میں پھرتا رہا صیاد بھی

وقت پڑتا ہے تو کوئی آشنا ہوتا نہیں
دشمنِ فرہاد نکلا تیشۂ فرہاد بھی

تجھ سے ملنے پر بُتِ بے درد یہ عقدہ کھلا
بھولی بھالی شکل والے ہوتے ہیں جلاد بھی

تم جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے کبھی
یہ بھی کہہ دو اب نہ آئے گی ہماری یاد بھی

کھو کے بچپن کا زمانہ، ہم بلاؤں میں پھنسے
ہوش بلبل کو جو آیا آگیا صیاد بھی

سادگی ہی سادگی معشوق میں اچھی نہیں
حسن میں کچھ کچھ جھلک دیتی رہے بے داد بھی

اے چمن والو چمن میں یوں گزارا چاہیے
باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

ہائے کیا حسرت کدہ دل تھا ہمارا اے جلیل
ہوگیا دو روز میں آباد بھی برباد بھی

محبت رنگ دے جاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے
مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

کشش ہے کب ہے خالی تشنہ کامی تشنہ کاموں کی
کہ بڑھ کر موجۂ دریا لبِ ساحل سے ملتا ہے

لٹاتے ہیں وہ دولت حسن کی باور نہیں آتا
ہمیں تو ایک بوسہ بھی بڑی مشکل سے ملتا ہے

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں ہائے کیا کہتے
یہ حالت ہے کہ بسمل جس طرح بسمل سے ملتا ہے

شہادت کی خوشی ایسی ہے مشتاقِ شہادت کو
کبھی خنجر سے ملتا ہے کبھی قاتل سے ملتا ہے

وہ مجھ کو دیکھ کر کچھ اپنے دل میں جھینپ جاتے ہیں
کوئی پروانہ جب شمعِ سرِ محفل سے ملتا ہے

خدا جانے غبارِ راہ ہے یا قیس ہے لیلیٰ
کوئی آغوش کھولے پردۂ محمل سے ملتا ہے

جلیلؔ اس کی طلب سے باز رہنا سخت غفلت ہے
غنیمت جانیے اس کو کہ وہ مشکل سے ملتا ہے

دل گیا دل لگی نہیں جاتی
روتے روتے ہنسی نہیں جاتی

آنکھیں ساقی کی جب سے دیکھی ہیں
ہم سے دو گھونٹ پی نہیں جاتی

کبھی ہم بھی تڑپ میں بجلی تھے
اب تو کروٹ بھی لی نہیں جاتی

ان کو سینے سے بھی لگا دیکھا
ہائے دل کی لگی نہیں جاتی

بات کرتے وہ قتل کرتا ہے
بات بھی جس سے کی نہیں جاتی

آپ میں آئے بھی تو کیا آئے
لذتِ بے خودی نہیں جاتی

ہیں وہی مجھ سے کاوشیں دل کی
دوست کی دشمنی نہیں جاتی

ہو گئے پھول زخم دل کھل کر
نہیں جاتی ہنسی نہیں جاتی

یہ کہہ گیا بُتِ ناآشنا سُنا کے مجھے
کہ آپ میں نہیں رہتا ہے کوئی پا کے مجھے

نقاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں
اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اٹھا کے مجھے

ملوں گا خاک میں آنسو کی طرح یاد رہے
ملو نہ آنکھ کہیں آنکھ سے گرا کے مجھے

ادا سے کھینچ رہا ہے کماں وہ تیر انداز
قضا پکار رہی ہے ذرا بچا کے مجھے

تمہارے واسطے اس دل کا مول ہی کیا ہے
ادا سے دیکھ لو اک دن نظر اٹھا کے مجھے

ترے حساب میں تیری قبا کا دامن ہوں
کہ جب مزاج میں آیا چلا لٹا کے مجھے

میں ڈر رہا ہوں تمہاری نشیلی آنکھوں سے
کہ لوٹ لیں نہ کسی روز کچھ پلا کے مجھے

بلند نام نہ ہوگا ستم شعاری سے
تم آسمان نہ ہو جاؤ گے ستا کے مجھے

بتوں کو تا کتے گزری ہے شرم آئے گی
جلیلؔ لے نہ چلو سامنے خدا کے مجھے

بے قراری سے مجھے آرام ہے
مفت میں دردِ جگر بدنام ہے

گیسوے شب گوں کا عالم کیا کہوں
صبح کیا ہوگی یہ جس کی شام ہے

اِک مرے دم کے لیے کتنے ہیں گھر
آشیانہ ہے قفس ہے دام ہے

وہ تو آنکھیں پھیر کر چلتے ہوئے
ہم ہیں اور اب گردشِ ایام ہے

منہ ترا دیکھے جو سوتے جاگتے
صبح اس کی ہے اسی کی شام ہے

آنکھ میں ڈوروں کا عالم دیکھیے
یہ نیا آہو اسیرِ دام ہے

بچ کے جائیں گے کہاں صیاد سے
ہم ہیں آگے پیچھے پیچھے دام ہے

ان کی صورت دیکھ لی خوش ہو گئے
ان کی سیرت سے ہمیں کیا کام ہے

ہر حسیں کے لب پہ ہے نام جلیل
اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے

قفس میں اشکِ حسرت پر مدارِ زندگانی ہے
یہی دل کا دانا ہے یہی پانی کا پانی ہے

ملے تھے آج برسوں میں مگر اللہ کی قدرت
وہی صورت وہی رنگت وہی جوشِ جوانی ہے

ہمیں وہ جان بھی لیں گے ہمیں پہچان بھی لیں گے
اتر جائے گا سب نشہ ابھی چڑھتی جوانی ہے

کلیجے سے لگا رکھوں نہ کیوں دردِ جدائی کو
یہی تو اک دلِ مرحوم کی باقی نشانی ہے

یہ سچ ہے یا غلط ہم نے سنا ہے مرنے والوں سے
ترے خنجر میں قاتل چشمۂ حیواں کا پانی ہے

بتائے جاتے ہیں اوصاف وہ اپنی اداؤں کے
یہ شانِ دل ربائی ہے یہ طرزِ جاں ستانی ہے

یہاں کیا جانیے کس طرح دیکھا ہے تصور میں
وہاں اب تک وہی پردے کے اندر لن ترانی ہے

کریں تسخیر آؤ مل کے ہم تم دونوں عالم کو
اِدھر جادو نگاہی ہے اُدھر جادو بیانی ہے

جلیلؔ اک شعر بھی خالی نہ پایا دردِ حسرت سے
غزل خوانی نہیں یہ درحقیقت نوحہ خوانی ہے

بنی ہے جان پہ جانے کی تم نے خوب کہی
مرا یہ حال پھر آنے کی تم نے خوب کہی

لگاؤ تیر انھیں جن سے آنکھ لڑتی ہے
مجھے نشانہ بنانے کی تم نے خوب کہی

یہاں تو خواب کا آنا خیال میں بھی نہیں
ہمارے خواب میں آنے کی تم نے خوب کہی

مجھے زمانہ بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
غرض ہے تم سے زمانے کی تم نے خوب کہی

دکن میں آج بھی قدر کمال ہوتی ہے
جلیلؔ اگلے زمانے کی تم نے خوب کہی

مار ڈالا مُسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اُسی انداز سے

کس نے کہہ دی ان سے میری داستاں
چونک چونک اٹھتے ہیں خوابِ ناز سے

پھر وہی وہ تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا
جس طرف دیکھا نگاہِ ناز سے

دردِ دل پہلے تو وہ سنتے نہ تھے
اب یہ کہتے ہیں ذرا آواز سے

مٹ گئے شکوے جب اس نے اے جلیل
ڈال دیں باہیں گلے میں ناز سے

لطافت میں مرا محبوب تصویر خیالی ہے
وہ پہلو میں ہے اور پہلو مرا خالی کا خالی ہے

تمھاری آرسی اللہ کیا تقدیر والی ہے
کھلی ہے صبح کو جب آنکھ تم پر آنکھ ڈالی ہے

فروغ رخ نے اندھا کر دیا نظارہ بازوں کو
نقاب اس نے اٹھا کر اور بھی صورت چھپالی ہے

بھرے آتے ہیں آنسو آنکھ میں جوش ندامت سے
کہوں کیوں کر میں اے ساقی کہ میرا جام خالی ہے

قیامت کا مجھے ڈر کیا جو کل آنی ہے آج آئے
تمھارے ساتھ کی کھیلی ہے میری دیکھی بھالی ہے

خوشی دل میں نہیں ساقی سرور آنکھوں میں خاک آئے
پیالے کیا بھریں جب خیر سے شیشہ ہی خالی ہے

ترے ہوتے یہ اس کو دیکھ سکتی ہے نہ وہ اس کو
برا ہو رشک کا آنکھوں میں کیسی پھوٹ ڈالی ہے

رخ نازک پہ دہرا بوجھ ہو یہ کب گوارا تھا
نقاب اس نے اٹھالی ہے نظر جب ہم نے ڈالی ہے

جلیل اپنا تخلص ہے وظیفہ خوش جمالوں کا
جلالی نام میں نام خدا شان جمالی ہے

آنکھیں نشیلی دیکھیے اس رشکِ حور کی
ہیں دو گلابیاں یہ شرابِ طہور کی

آئی جو اب سمجھ تو وہ آنکھیں نہیں رہیں
نرگس کے پھول دینے لگے بو غرور کی

دیکھوں ہزار آنکھ سے جلوہ ترا مگر
جب دیکھنے بھی دے مجھے کثرت ظہور کی

احسان آپ کا ہے کہ مایوس کر دیا
تسکین اب تو ہو گئی دلِ ناصبور کی

کس شان سے ہیں بیٹھے ہوئے پیشِ آئینہ
تصویر لے رہے ہیں وہ اپنے غرور کی

موسیٰ کے اضطراب نے اچھا دیا جواب
دیکھی تڑپ تو ٹوٹ گئی برق طور کی

کیا بے کسی بیان ہو شامِ فراق کی
اک میں ہوں اک تڑپ ہے دلِ ناصبور کی

کچھ اور انکسار سے اپنی غرض نہیں
منظور ہے شکست تمہارے غرور کی

شرمِ گنہ سے حشر میں روپوش ہے جلیلؔ
پھرتی ہے ڈھونڈتی اسے رحمت غفور کی

میں وہ بلبل ہوں قفس سے جو رہائی ہوتی
بوئے گل دور سے لینے مجھے آئی ہوتی

پھر کہاں جلوۂ جاناں کی بہار اے موسیٰ
ایسے موقع پہ تمھیں نیند نہ آئی ہوتی

چاہتا ہوں کوئی امید نہ رکھوں ان سے
کاش میری یہی امّید بر آئی ہوتی

تیری آنکھوں کو تو جادو ہی جگاتے گزری
کوئی سوئی ہوئی تقدیر جگائی ہوتی

بے خودی خوب تھی پابندِ علائق کے لیے
یہ جو ہوتی تو اسیری میں رہائی ہوتی

تجھ کو آنے سے ہے انکار یہ مانا ہم نے
بات جب تھی کہ تری یاد نہ آئی ہوتی

بال و پر ہیں جو سلامت تو خوشی کیا صیّاد
کچھ نہ ہوتا مگر امّیدِ رہائی ہوتی

گر اُسے پردۂ کثرت میں نہ چھپنا ہوتا
ذرے ذرے میں نہ یوں جلوہ نمائی ہوتی

شکر ہے حشر میں پرسش نہ ہوئی اپنی جلیلؔ
ورنہ ہم سے نہ کوئی بات بن آئی ہوتی

اپنے رہنے کا ٹھکانا اور ہے
یہ قفس یہ آشیانا اور ہے

موت کا آنا بھی دیکھا بارہا
پر کسی پر دل کا آنا اور ہے

ناز اٹھانے کو اٹھاتے ہیں سبھی
اپنے دل کا ناز اٹھانا اور ہے

دردِ دل سن کر تمھیں نیند آ چکی
بندہ پرور یہ فسانا اور ہے

رات بھر میں شمعِ محفل جل بجھی
عاشقوں کا دل جلانا اور ہے

ہم کہاں پھر باغباں گلشن کہاں
ایک دو دن آب و دانا اور ہے

بھولی بھولی ان کی باتیں ہو چکیں
اب خدا رکھے زمانا اور ہے

چھوڑ دوں کیوں کر درِ پیرِ مغاں
کوئی ایسا آستانا اور ہے

یارِ صادق ڈھونڈتے ہو تم جلیلؔ
مشفقِ من یہ زمانا اور ہے

مری طرف سے یہ بے خیالی نہ جانے ان کو خیال کیا ہے
کبھی نہ پوچھا ملال کیا ہے کبھی نہ دیکھا کہ حال کیا ہے

تجھی کو جانا تجھی کو مانا تجھی پہ دی جان غائبانہ
چھپا نہیں کچھ مرا فسانہ یہ اب جواب و سوال کیا ہے

نظر اٹھائیں جو آرسی سے تو ان سے پوچھوں یہ میں ہنسی سے
لگائی ہے آگ کیا کسی سے کہو تو یہ دیکھ بھال کیا ہے

کہاں تک اے واعظو یہ جھگڑے مزے اٹھانے دو بے خودی کے
جو ہوش میں ہوں تو میں یہ سمجھوں حرام کیا ہے حلال کیا ہے

بس اب محبت سے ہاتھ اٹھاؤ بھلے کو کہتے ہیں مان جاؤ
نہ آپ کو اس طرح مٹاؤ جلیل دیکھو تو حال کیا ہے

کتنی گہری مرے ساقی کی نظر ہوتی ہے
مجکو پہروں میں کہیں اپنی خبر ہوتی ہے

بس بس آواز سناؤ نہ مجھے پردے سے
دیدۂ شوق میں بے چین نظر ہوتی ہے

جام مے شیشۂ لبریز کا دیتا ہے پتہ
دل بھر آتا ہے جبھی آنکھ بھی تر ہوتی ہے

آئینہ آپ کو تکتا ہے نظر اس پہ نہیں
اک نظر ہم ابھی دیکھیں تو نظر ہوتی ہے

شام ہوتے ہی کبھی جان سی آجاتی تھی
اب وہی شب ہے کہ مر مر کے بسر ہوتی ہے

حشر کیا ہوش میں لائے گا ترے مستوں کو
پھک چکا صور مگر کس کو خبر ہوتی ہے

فکر دنیا کی غرض ہے نہ خبر عقبیٰ کی
زندگی تو ترے مستوں کی بسر ہوتی ہے

اس طرح بھیس میں عاشق کے چھپا ہے معشوق
جس طرح آنکھ کے پردے میں نظر ہوتی ہے

خیر ہم شام غریبی کی مناتے ہیں جلیلؔ
جس کے سایے میں غریبوں کی بسر ہوتی ہے

جھوم کر آج جو متوالی گھٹا آئی ہے
یاد کیا کیا تری مستانہ ادا آئی ہے

ایسے نازک کبھی پابندِ حنا ہوتے ہیں
ہاتھ دھو ڈالے ہیں رنگت جو ذرا آئی ہے

تم بھی رخسار پہ زلفوں کو ذرا بکھرا دو
کالی کالی سرِ گلزار گھٹا چھائی ہے

حسنِ اخلاق بھی ہے حسنِ جوانی کی طرح
جھک گئی ہیں تری آنکھیں جو حیا آئی ہے

ہائے وہ کھول کے جوڑا یہ کسی کا کہنا
آیئے سو رہیں اب رات سوا آئی ہے

سچ ہے تم نے جو لگایا نہیں منہ غنچوں کو
انھیں پھر کس کے تبسم کی ادا آئی ہے

کس کا دل خون نہیں ہے چمنِ عالم میں
پتی پتی سے ہمیں بوئے وفا آئی ہے

رات پھر گریۂ شبنم سے جو غنچے تھے اداس
صبح ہوتے ہی ہنسانے کو صبا آئی ہے

شعر خوانی پہ تری سب کو گماں ہے کہ جلیلؔ
بزم میں روحِ امیر الشعرا آئی ہے

لاگ کی آگ کسی طرح بجھائی نہ گئی
آنکھ جس دن سے لگی آنکھ لگائی نہ گئی

خود نمائی سے تری شکل چھپائی نہ گئی
گئی جس بزم میں بنتی ہوئی آئینہ گئی

رات بھر آپ ہی تکا کیے وہ اپنی بہار
آرسی آنکھ کے آگے سے ہٹائی نہ گئی

آئینہ دیکھتے ہی لوٹ گیا وہ خود میں
چوٹ بھی سامنے کی اس سے بچائی نہ گئی

بس بس اے دیدۂ گریاں تجھے ہم دیکھ چکے
آج تک دل کی لگی تجھ سے بجھائی نہ گئی

آنکھیں دو جام سہی بلکہ ہیں دو میخانے
ہم کو تو آپ سے دو گھونٹ پلائی نہ گئی

ڈال دی جلوۂ دیدار نے پھوٹ آنکھوں میں
آج تک اشک سے آپس کی جدائی نہ گئی

چل بھی اے تیغ روانی تری دیکھی ہم نے
ہم ترستے ہی رہے پیاس بجھائی نہ گئی

عمر سب کٹ گئی باتیں ہی بنانے میں جلیلؔ
اپنی بگڑی ہوئی افسوس بنائی نہ گئی

وقتِ دید آنکھوں میں جانِ زار ہے
ہائے کیا شے لذتِ دیدار ہے

ان سے کہتا ہوں دکھا کر آئینہ
اِک حسیں ایسا مجھے درکار ہے

تھی کوئی صورت ان آنکھوں میں کبھی
جس جگہ اب حسرتِ دیدار ہے

ہو کے بسمل کچھ تو آنسو پچھ گئے
زخم جو کھایا ہے دامندار ہے

جان دینے کا ہوا ان پر کیا اثر
جانتے ہیں جان سے بیزار ہے

جس کا ہمت حوصلہ اتنی تلاش
تجھکو عالم مجھکو تو درکار ہے

وصل ہی کا نام جب ٹھہرا وصال
آرزوئے مرگ بھی بیکار ہے

دیکھ کر دنیا کی رونق دنگ ہوں
کون سے یوسف کا یہ بازار ہے

جانتے بھی وہ نہیں بازار کو
جن کی ساری گرمیِ بازار ہے

شعر گوئی کی کسے فرصت جلیلؔ
یہ تو اپنے درد کا اظہار ہے

کہوں کیا اضطرابِ دل زباں سے
رہے جاتے ہیں سب پہلو بیاں سے

انھیں چہکا رہا ہوں چاند کہہ کر
عوض لینا ہے مجکو آسماں سے

ہم ایسے ناتواں وہ ایسے نازک
اٹھائے کون پردہ درمیاں سے

شمیمِ گل نے بڑھ کر حال مارا
قدم باہر جو رکھا آشیاں سے

تڑپ میری ترقی کر رہی ہے
زمیں ٹکرا نہ جائے آسماں سے

خدا رکھے چمن کا پھول ہو تم
ہنسو کھیلو نسیمِ بوستاں سے

نگاہ گل سے بلبل یوں گری ہے
گرے جس طرح تنکا آشیاں سے

زمینِ شعر ہم کرتے ہیں آباد
چلے آتے ہیں مضموں آسماں سے

بڑا اسنگر تھا شعر و شاعری کا
اٹھا کیونکر جلیلِ ناتواں سے

صورت اشک نظر سے جو گرائے کوئی
خاک سے اُٹھ نہ سکوں لاکھ اٹھائے کوئی

نازنیں تو ہے تجھے دل میں اٹھا کر رکھ لوں
کیا پڑی ہے جو ترے ناز اٹھائے کوئی

اچھے اچھوں کو یہ دیوانہ بنا دیتی ہے
دخت رز کو تو کبھی منہ نہ لگائے کوئی

خود فراموش ہوئے ہم تو ہوا کیا حاصل
بات جب ہے کہ ہمیں یاد نہ آئے کوئی

حال تم سُن لو مرا دیکھ لو صورت میری
درد وہ چیز نہیں ہے کہ دکھائے کوئی

طور و موسیٰ کا جو انجام ہوا ظاہر ہے
ہم کو پردے سے نہ آواز سنائے کوئی

راحت و عیش و طرب سب ہیں تمھارے دم سے
تم مرے گھر میں نہ آؤ تو نہ آئے کوئی

اپنا پروانہ بنا کر ہمیں اب کہتے ہیں
بے بلائے مری محفل میں نہ آئے کوئی

پھیر لیتے ہیں نظر وہ تو زمانے کی طرح
کس لیے ان سے جلیل آنکھ لگائے کوئی

ہٹا دے اپنے چہرے سے نقاب اے یار تھوڑی سی
نکلنے دے خدارا حسرتِ دیدار تھوڑی سی

ہوا پورا نہ یہ ارماں بھی قاتل کی نزاکت سے
گلے پر میرے چل کر رہ گئی تلوار تھوڑی سی

تمنا ہے کہ تیرے ہاتھ سے پینے کو مل جائے
نہیں پروا بہت سی ہو کہ ہو اے یار تھوڑی سی

بڑی قسمت ہے ان کی جو پڑے ہیں آپ کے در پر
جگہ ہم کو بھی مل جائے پسِ دیوار تھوڑی سی

ہزاروں کی تمنا آپ کے ہاتھوں ہوئی پوری
جلیلِ زار کی بھی عرض ہے اے یار تھوڑی سی

اب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے
او شوخ چشم پھونک دے برقِ نگاہ سے

کس شان سے چلا ہے مرا شہسوارِ حسن
فتنے پکارتے ہیں نداہٹ کے راہ سے

جھپکی پلک تو برق فلک سے زمیں پہ تھی
سنبھلا نہ کوئی گر کے تمھاری نگاہ سے

دلچسپ ہو گئی ترے چلنے سے رہگزر
اُٹھ اٹھ کے گردِ راہ لپٹتی ہے راہ سے

میزاں کھڑی ہوئی ہے آگے نہ روزِ حشر
دبنا پڑا اُسے مرے بارِ گناہ سے

دیکھو پھر ایسے دیکھنے والے نہ پاؤ گے
کیوں خاک میں ملاتے ہو نیچی نگاہ سے

آئینے آرسی تو فقط دیکھنے کے ہیں
دیکھو تم اپنے حسن کو میری نگاہ سے

کثرت سے مے جو پی ہے نظر ہے مآل پر
رعشہ نہیں ہے کانپ رہا ہوں گناہ سے

پایا بلند کیوں نہ ہمارا ہو اے جلیل
پایا ہے فیضِ امیرِ سخن دستگاہ سے

اور ان آنکھوں نے میرے دل کی حالت زار کی
ہو نہیں سکتی دوا بیمار سے بیمار کی

مُہر کی اُن پر ضرورت کیا ہے اے پیرِ مُغاں
ایک اک خُم پر لگی ہے آنکھ ہر میخوار کی

خیر ہو یارب کہیں وہ خود نہ بن جائیں رقیب
آئینے پر آج پڑتی ہیں نگاہیں پیار کی

خون کر کے دل ہمارا پھر گئی وہ مست آنکھ
ایک ہی چلّو میں نیّت بھر گئی میخوار کی

دید کے طالب تھے موسیٰ طور کو تھی کیا خبر
پھونک کر رکھ دے گی بجلی جلوۂ دیدار کی

جلوۂ محبوب سے خالی نہ دیکھا دل کوئی
آئینے ہیں سیکڑوں اور ایک صورت یار کی

ہو سبک رفتار کتنی ہی نسیم صبحدم
آنکھ کھُل جاتی ہے پھر بھی نرگس بیمار کی

دخترِ رز نے دیئے چھینٹے کچھ ایسے ساقیا
پانی پانی ہو گئی توبہ ہر اک میخوار کی

کچھ پھلے پھولے نہ یہ نازک فضا میں اے جلیلؔ
بے رکھلے مرجھا گئیں کلیاں مرے گلزار کی

مرنے والے خوب چھوٹے گردشِ ایام سے
سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے آرام سے

اور تو مطلب نہیں کچھ ہم کو دورِ جام سے
ہاں عوض لیتا ہے ساقی گردشِ ایام سے

گرچہ ترکِ آشنائی کو زمانہ ہو گیا
لیکن اب تک چونک اٹھتے ہیں وہ میرے نام سے

اشتیاقِ میکشی کچھ میکشی سے کم نہیں
ہم تو ساقی مست ہو جاتے ہیں خالی جام سے

میکدے کا راز پردے ہی میں رہنا خوب تھا
دیکھ ساقی شیشہ کچھ کہتا ہے جھک کر جام سے

زلفِ سنبل نکہتِ گل موجِ سبزہ موجِ آب
باغ میں کوئی جگہ خالی نہ دیکھی دام سے

ہم فقیرِ میکدہ ساقی ہمیں کیا چاہیئے
ہے وہی کافی چھلک جاتی ہے جتنی جام سے

بے نشاں تجھ کو سمجھ کر صبر آجاتا مجھے
پر یہ مشکل ہے کہ میں واقف ہوں تیرے نام سے

کیا خدا کی شان ہے جن کا وظیفہ تھا جلیلؔ
آج وہ کہتے ہیں ہیں واقف نہیں اس نام سے

انھیں عادت ہمیں لذت ستم کی
اُدھر شمشیر، اِدھر تقدیر چمکی

کہوں کیا دردِ دل کب سے بڑھا ہے
نگاہِ لطف تم نے جب سے کم کی!

قدم چومیں گے تیرے ہو کے پامال
چلیں گے چال ہم نقشِ قدم کی

یہاں تک ان کے وعدے جھوٹ نکلے
قسم کو بھی ہوئی حاجت قسم کی

وہ زلفِ مشکبو بکھری ہوئی تھی
کھلی چوری نسیمِ صبحدم کی

یہاں تک ان کو پاسِ رازِ خط تھا
کہ خامے کی زباں پہلے قلم کی

زمیں پر اس ادا سے پاؤں رکھا
کہ آنکھیں کھل گئیں نقشِ قدم کی

کہاں پیری میں وہ روشن بیانی
زباں تو ہے چراغِ صبحدم کی

کہاں ہم اور کہاں بخشش ہماری
جلیل اِک موج بھی ابرِ کرم کی

یارب ہو خیر جوشش پہ سودا ابھی سے ہے
ہاتھ اپنا اور دامنِ صحرا ابھی سے ہے

ہم کیا کریں سوال یہ سوچا نہیں ابھی
وہ کیا جواب دیں گے یہ دھڑکا ابھی سے ہے

کم سن سہی، وہ شوخ سہی، ناسمجھ سہی
ہے کچھ تو بات ہم سے جو پردا ابھی سے ہے

دیکھوں گا اس جمال کو یارب کس آنکھ سے
حیرت کا تو پڑا ہوا پردا ابھی سے ہے

نامہ ابھی لکھا نہیں قاصد گیا نہیں
لیکن امید و یاس میں جھگڑا ابھی سے ہے

پردا اٹھا نہیں کہ تماشائے حسن ہو
مشتاق جو ترا ہے تماشا ابھی سے ہے

تم ناسمجھ سہی مگر اتنا تو جان لو
کوئی تمہارا چاہنے والا ابھی سے ہے

سنتے ہیں آج ہوں گے وہ گلشن میں جلوہ گر
ایک ایک پھول دیدۂ موسیٰ ابھی سے ہے

انجامِ کار دیکھئے ہوتا ہے کیا جلیل
گھر گھر ہمارے عشق کا چرچا ابھی سے ہے

دیدار کی ہوس ہے نہ شوقِ وصال ہے
آزاد ہر خیال سے مستِ خیال ہے

کہہ دو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجرِ یار میں جینا کمال ہے

فتویٰ دیا ہے مفتیِ ابرِ بہار نے
توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے

آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات کو
ان ساغروں میں بوئے شراب وصال ہے

برساؤ تیر مجھ پہ مگر اتنا جان لو
پہلو میں دل ہے دل میں تمھارا خیال ہے

آنکھیں لڑا کے ان سے ہم آفت میں پڑ گئے
پلکوں کی ہر زبان پہ دل کا سوال ہے

بت کہہ دیا جو میں نے تو اب بولتے نہیں
اتنی سی بات کا تمھیں اتنا خیال ہے

میں دامنِ نیاز میں اشکِ چکیدہ ہوں
کوئی اٹھا کے دیکھ لے اٹھنا محال ہے

پوچھا جو اُن سے جانتے ہو تم جلیلؔ کو
بولے کہ ہاں وہ شاعرِ نازک خیال ہے

چاہیے دنیا نہ عقبیٰ چاہیے
جو تجھے چاہے اُسے کیا چاہیے

زندگی کیا جو بسر ہو چین سے
دل میں تھوڑی سی تمنّا چاہیے

تابِ نظارہ ان آنکھوں کو کہاں
دیکھنے والوں سے پردا چاہیے

مجھکو دیکھو اور میری آرزو
اک حسیں اچھے سے اچھا چاہیے

وہ بہت دیر آشنا ہے جلیلؔ
آشنائی کو زمانا چاہیے

ایک دن بھی تو نہ اپنی رات نورانی ہوئی
ہم کو کیا اے مہ جبیں گر چاند پیشانی ہوئی

سرد مہری کا تری ساقی نتیجہ یہ ہوا
آگ کے مولوں جو بجتی تھی وہ مے پانی ہوئی

اللہ اللہ پھوٹ نکلا رنگ چاہت کا مری
زہر کھایا میں نے پوشاک آپ کی دھانی ہوئی

ہم کو ہو سکتا نہیں دھوکا ہجوم حشر میں
تیری صورت ہے ازل سے جانی پہچانی ہوئی

لے اڑی گھونگٹ کے اندر سے نگاہِ مست ہوش
آج ساقی نے پلائی مے ہمیں چھانی ہوئی

جان کر دشمن جو لپٹے جان میں جاں آگئی
بارک اللہ کس مزے کی تم سے نادانی ہوئی

رفتہ رفتہ دیدۂ تر کو ڈبویا اشک نے
پانی رستے رستے کشتی میری طوفانی ہوئی

کر گئی دیوانگی ہم کو بری ہر جرم سے
چاک دامانی سے اپنی پاک دامانی ہوئی

خون کی چادر مبارک باحیا تلوار کو
میان سے باہر نکل کر بھی نہ عریانی ہوئی

رات کو چھپ کر نکل جاتی ہے آنکھوں سے جلیلؔ
سیر دیکھو نیند بھی کمبخت سیلانی ہوئی

بچپن سے ان کی آنکھ میں شوخی بلا کی ہے
بجلی میں ابتدا سے تڑپ انتہا کی ہے

گرما کے داغ دل کو یہ کہتی ہے آہِ سرد
پھولوں میں ساری آگ لگائی صبا کی ہے

کیا کہیے کہ فاش نہ ہو پردۂ جنوں!
مثلِ خبر اڑی ہوئی دھجی قبا کی ہے

دیکھو تو میکدہ پہ ذرا اس کا جھومنا
رندوں سے بھی بڑھی ہوئی مستی گھٹا کی ہے

کیا جانے کوئی قدر ہماری شراب کی
ہر گھونٹ میں پڑی ہوئی رحمت خدا کی ہے

فتنے زمانے بھر کے ہیں چشمِ سیاہ میں
اس کال کوٹھری میں جگہ ہر بلا کی ہے

ہاں ساقی اپنے شیشہ و ساغر سے ہوشیار
دیکھ آج میکدے پہ چڑھائی گھٹا کی ہے

کیا خوبصورت آنکھ ہے قربان جائیے
شوخی کی لاڈلی ہے تو پیاری حیا کی ہے

کیا کیا ہیں گُن جلیلؔ کے دل میں بھرے ہوئے
صورت جو دیکھیے تو بڑے پارسا کی ہے

یہ کہنا اس سے اے قاصد جو محو خود پرستی ہے
کہ تیرے دیکھنے کو آنکھ مدت سے ترستی ہے

نہ صہبا ہے نہ ساغر ہے نہ مینا ہے نہ خم ساقی
مجھے جو مست کرتی ہے تری آنکھوں کی مستی ہے

وہ جنسِ دل کی قیمت پوچھتے ہیں میں بتاؤں کیا
یہی مہنگی سے مہنگی ہے یہی سستی سے سستی ہے

مدارِ زندگی ٹھہرا نفس کی آمد و شد پر
ہوا کے زور سے روشن چراغِ بزمِ ہستی ہے

یقیں جانو کہ منھ دیکھی محبت ہم نہیں رکھتے
وہ آئینہ ہے جو وارفتۂ صورت پرستی ہے

تماشا ہے مری رندی کہ ساغر ہاتھ میں لیکر
ہر اک سے پوچھتا ہوں میں کہیں تھوڑی سی مستی ہے

جبھی تو عکس قائم ہے کہ آئینہ مقابل ہو
ہماری یہ حقیقت ہے ہماری اتنی ہستی ہے

وہ میکش ہوں کہ آتا ہے جو لب پر نام توبہ کا
تو مجھ پر جوش میں آکر گھٹا کیا کیا برستی ہے

جلیلؔ استاد کا کہنا سنو باندھو کمر تم بھی
عجب بستی مدینہ ہے جہاں رحمت برستی ہے

دن کی آہیں نہ گئیں رات کے نالے نہ گئے
میرے دلسوز مرے چاہنے والے نہ گئے

اپنے ماتھے کی شکن تم سے مٹائی نہ گئی
اپنی تقدیر کے بل ہم سے نکالے نہ گئے

تذکرہ سوزِ محبت کا کیا تھا اک بار
تادمِ مرگ زباں سے مری چھالے نہ گئے

شمع رو ہو کے فقط تم نے جلانا سیکھا
میرے غم میں کبھی دو اشک نکالے نہ گئے

آج تک ساتھ ہیں سرکار جنوں کے تحفے
سر کا چکر نہ گیا پاؤں کے چھالے نہ گئے

وہ بھلا پیچ نکالیں گے مری قسمت کے
اپنے بالوں کے تو بل ان سے نکالے نہ گئے

کوئی شب ایسی نہ گزری کہ بنا کر گیسو
سیکڑوں بل مری تقدیر میں ڈالے نہ گئے

ہمسفر ایسے وفادار کہاں ملتے ہیں
تیرے وحشی کے قدم چھوڑ کے چھالے نہ گئے

اپنا دیوان مرقع ہے حسینوں کا جلیلؔ
نکتہ چیں تھک گئے کچھ عیب نکالے نہ گئے

یارب آباد رہے خاک بیابانوں کی
پردہ پوشی ہوئی جس سے ترے عریانوں کی

جامِ مے اور کسی رند کو دے پیرِ مغاں
جو ہمیں مست کیے دیتی ہے میخانوں کی

سیکڑوں چاک نظر آنے لگے دامن میں
لے جنوں کھل گئیں راہیں یہ بیابانوں کی

کیاریاں دیکھ کے پھولوں کی وہ فرماتے ہیں
ٹکڑیاں ہیں یہ مرے چاک گریبانوں کی

پاؤں چھلنی ہوئے کانٹوں سے چلو خوب ہوا
خاک اب اور بھی چھانیں گے بیابانوں کی

بعد مدت ترے وحشی کے جو آئے ہیں قدم
گرد اٹھ اٹھ کے پٹتی ہے بیابانوں کی

نہ رہے دشت میں وہ گور و کفن کے محتاج
آبرو خاک نے رکھ لی ترے دیوانوں کی

شمع گل ہو کے فنا کر گئی پروانوں کو
دل کے مٹنے سے تباہی ہوئی ارمانوں کی

ہو گیا سیرِ گلستاں سے تو جی سیر جلیلؔ
آؤ اب چل کے ہوا کھائیں بیابانوں کی

عکس ہے آئینۂ دہر میں صورت میری
کچھ حقیقت نہیں اتنی ہے حقیقت میری

دیکھتا میں اُسے کیونکر کہ نقاب اُٹھتے ہی
بن کے دیوار کھڑی ہو گئی حیرت میری

روز وہ خواب میں آتے ہیں گلے ملنے کو
میں جو سوتا ہوں تو جاگ اٹھتی ہے قسمت میری

سچ ہے احسان کا بھی بوجھ بہت ہوتا ہے
چار پھولوں سے دبی جاتی ہے تربت میری

آئینے سے انھیں کچھ انس نہیں بات یہ ہے
چاہتے ہیں کوئی دیکھا کرے صورت میری

میں یہ سمجھوں کوئی معشوق مرے ہاتھ آیا
میرے قابو میں جو آجائے طبیعت میری

بوئے گیسو نے شگوفہ یہ نیا چھوڑا ہے
نکہتِ گل سے الجھتی ہے طبیعت میری

ان سے اظہارِ محبت جو کوئی کرتا ہے
دُور سے اس کو دکھا دیتے ہیں تربت میری

جاتے جاتے وہ یہی کر گئے تاکید جلیلؔ
دل میں رکھیے گا حفاظت سے محبت میری

او برق جمال اب رُخِ روشن کو چھپا لے
اندھے ہوئے جاتے ہیں ترے دیکھنے والے

اس زلف کے پھندے سے نکلنا نہیں ممکن
ہاں مانگ کوئی راہ نکالے تو نکالے

کانٹے بھی اگر چھوٹ گئے ٹوٹ کے ان سے
پھوٹی ہوئی قسمت کو بہت روئیں گے چھالے

سو تہہ سے نمودار ہو ابھرا ہوا جوبن
یہ دل نہیں جس کو کوئی آنچل میں چھپا لے

تقدیر یہ دل کی کہ وہ نازک ہوئے ایسے
ارمان نکلتے ہی نہیں ان کے نکالے

کانٹے انھیں نشتر کی طرح چھیڑ رہے تھے
منہ کھولتے کب تک نہ مرے پاؤں کے چھالے

اب آپ کو پردے میں چھپا رکھنے سے حاصل
سب جان گئے حال مرا دیکھنے والے

تربت پہ ہیں کچھ پھول پڑے نقش قدم کے
گزرا ہے ادھر سے کوئی دامن کو سنبھالے

کچھ چھیڑ کے منہ چوم کے سینے سے لگا کے
جس طرح بنے آج جلیل ان کو منا لے

یوں نہ ٹپکا تھا لہو دیدۂ تر سے پہلے
دیکھنا آگ لگی پھر اسی گھر سے پہلے

جیسے جیسے درِ دلدار قریب آتا ہے
دل یہ کہتا ہے کہ پہنچوں میں نظر سے پہلے

نامۂ یار پڑھوں میں ابھی جلدی کیا ہے
نامہ بر کو تو لگا لوں میں جگر سے پہلے

بے حجابی جو سہی ہے تری شوخ آنکھوں کی
رسم پردے کی اٹھے گی اسی گھر سے پہلے

اے جلیلؔ آپ بھی کس دھیان میں ہیں خیر تو ہے
خواہشِ قدرِ ہنر کسبِ ہنر سے پہلے

نیند تو ان کی اڑی کیا جانے کس کی یاد سے
مجھ سے برہم ہیں اُلجھتے ہیں مری فریاد سے

یاد جاتے جاتے جائے گی چمن کی ہمصفیر
انس ہوتے ہوتے ہوگا خانۂ صیاد سے

اب تو جیتے جی قفس سے چھوٹنا ممکن نہیں
بلبلو ناخوش رہو یا خوش رہو صیاد سے

سیرِ گل تو کر چکے ہنس ہنس کے یارانِ چمن
آؤ اب کچھ رو لیں مل کر بلبلِ ناشاد سے

اللہ اللہ کیا توجہ ہے کہ ہم اب تک جلیل
فیض پاتے ہیں مزارِ حضرتِ استاد سے

جانِ سخن

(دیوان دوم)

۱۹۱۰ء ——— ۱۹۱۶ء

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیلؔ
بادل کا رنگ دیکھ کے نیّت بدل گئی

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بت خانے سے

قصیدہ تخت نشینی

نواب میر عثمان علی خاں بہادر نظام الملک آصف جاہ سلطان دکن

بزمِ عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا — حالتِ وجد میں ساغر کو بھی رقصاں دیکھا
پھول مقصد کے کھلے ہیں تو شگوفے دل کے — جو نہ دیکھا تھا کبھی وہ چمنستاں دیکھا
غنچۂ دگل سے بھلا ضبطِ خوشی کیا ہوتی — ہنس پڑے وہ بھی جو سرکار کو خنداں دیکھا
تھی نسیمِ سحر آگاہ کہ ہے وقتِ خوشی — کر گئی شمع کو خاموش جو گریاں دیکھا
ایک اِک گھر پہ برستی ہوئی رحمت دیکھی — ایک اِک دل سے نکلتے ہوئے ارماں دیکھا
تخت کے تاج کے مالک مرے سرکار ہوئے — تخت کو تاج کو تقدیر پہ نازاں دیکھا
للہ الحمد کہ اورنگ نشینِ اقبال — بعد آصف تجھے عثمان علی خاں دیکھا
للہ الحمد کہ خدّام وفا پرور نے — تجھے آقا تجھے مالک تجھے سلطاں دیکھا
ابرِ رحمت کی طرح خلق خدا کے سر پر — سایہ افگن تجھے اے سایۂ یزداں دیکھا
دوست دشمن پہ رعایا پہ زمانے بھر پر — تیری شفقت تری بخشش ترا احساں دیکھا
حبذا ساتھ ترے نصرتِ باری دیکھی — مرحبا ہاتھ ترے فتح کا میداں دیکھا
کان سے وصفِ سکندر جو سنا تھا ہم نے — آنکھ سے آج وہ اے خسروِ ذیشاں دیکھا
کبھی چھپتے نہیں اوصاف جو آبائی ہیں — آصفی شان کو تیور سے نمایاں دیکھا
روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے — آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا
چوری چوری جو نظر شہ کی طرف جاتی ہے — رعبِ دربار یہ کہتا ہے کہ ہاں ہاں دیکھا
بخت و دولت کو حکومت کو جہانداری کو — تیرے قابل ترے لائق ترے شایاں دیکھا
جس طرح ابر کے ٹکڑے سے ہو منہ کی بارش — دستِ فیاض کو یوں ہی گہر افشاں دیکھا

دو نہیں ، چار نہیں ، سو نہیں سو لاکھ نہیں　　سارے عالم کو ترا بندۂ احساں دیکھا
دولت و جاہ و حشم کو ہے عقیدت کیسی　　اسے شیدا اسے صدقے اسے قرباں دیکھا
جس نے دربار ترا دیکھ لیا پھر اس نے　　آنکھ اٹھا کر نہ کبھی سوئے گلستاں دیکھا
سچ ہے نظارۂ دربار کچھ آسان نہیں　　جس کو دیکھا صفت آئینہ حیراں دیکھا
یوہیں دیکھیں فلک پیر کو ہم لاکھ برس　　جس طرح آج ترا تابع فرماں دیکھا

ایک تجھ پر نہیں موقوف زمانے کو جلیل
میر عثمان علی خاں کا ثنا خواں دیکھا

خرمنِ جاں کے لیے برق ہے جلوہ تیرا
آفریں اس کو جو ہے دیکھنے والا تیرا

دیکھنے پر نہیں کچھ حسن کی شہرت موقوف
تو ہے پردے میں زمانے میں ہے چرچا تیرا

مجھ کو سرکارِ جنوں سے یہ ملے ہیں تحفے
بیڑیاں پاؤں میں ہیں سر میں ہے سودا تیرا

پھول سی شکل تری دیکھ کے دل آیا تھا
کیا خبر تھی کہ ہے پتھر کا کلیجا تیرا

جان لی تو نے ہزاروں کی مگر اس پر بھی
دردمندوں میں رہا نام مسیحا تیرا

جس کو انکار قیامت سے ہے اے فتنہ خرام
اس نے دیکھا نہیں شاید قدِ رعنا تیرا

یہ بھی اک تیری نزاکت کا اثر ہے ظالم
دل سے لب تک نہیں آتا کبھی شکوا تیرا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ناممکن ہے
میں جلوں اور کلیجا رہے ٹھنڈا تیرا

یار و اغیار سے شکوہ تجھے ناحق ہے جلیلؔ
سب سے بڑھ کر ہے مصیبت دلِ شیدا تیرا

ساقی نے مست نرگسِ مستانہ کر دیا
ایسی پلائی آج کہ دیوانہ کر دیا

ٹھنڈا رہے وہ جس نے لگا کر جگر میں آگ
شمعِ جمال کا مجھے پروانہ کر دیا

تیرا شباب دیکھ کے جاتے رہے حواس
فصلِ بہار نے مجھے دیوانہ کر دیا

ہوتا ہے سحر آنکھ میں لیکن نہ اس قدر
جس پر نگاہ پڑ گئی دیوانہ کر دیا

سو سو کو مست کرتے ہیں اِک اِک نگاہ میں
جس بزم میں گئے اسے میخانہ کر دیا

پردے کی شکل خوب نکالی یہ آپ نے
آیا جو سامنے اسے دیوانہ کر دیا

رسوائیوں کے خوف سے آفت میں جان تھی
اچھا کیا جو آپ نے دیوانہ کر دیا

کی محتسب نے آج یہ اصلاحِ میکدہ
شیشوں کو توڑ توڑ کے پیمانہ کر دیا

ہر وقت اس میں شوخ حسینوں کا ہے خیال
دل کو جلیلؔ تم نے پری خانہ کر دیا

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

شکر کرتا ہوں کہ منت کش ساقی نہ ہوا
ہو گیا مست سماں دیکھ کے میخانے کا

جان دیدے نہ کرے آہ بہت مشکل ہے
عشق کرنے کو جگر چاہیئے پروانے کا

تو نے صورت نہ دکھائی تو یہ صورت ہوگی
لوگ دیکھیں گے تماشا ترے دیوانے کا

تاب نظارۂ معشوق کہاں عاشق کو
شمع آئی کہ ہوا خاتمہ پروانے کا

سب ہیں مدہوش یہاں ہوش نہ آئے ساقی
بزم احباب میں کیا کام ہے بیگانے کا

رات بھر آتشِ حسرت سے جلا کرتی ہے
شمع پر صبر پڑا ہے کسی پروانے کا

صحبت پیرمغاں میں یہ کھلا راز جلیلؔ
خلد کہتے ہیں جسے نام ہے میخانے کا

کس قدر تھا گرم نالہ بلبلِ ناشاد کا
آگ پھولوں میں لگی گھر جل گیا صیاد کا

سہل سمجھا تھا ستانا بلبلِ ناشاد کا
چار نالوں میں کلیجا ہل گیا صیاد کا

زیرِ خنجر میں تڑپتا ہوں فقط اس واسطے
خون میرا اُڑ کے دامنگیر ہو جلاد کا

درپئے آزار پہلے آسماں اتنا نہ تھا
پا گیا ہے کچھ اشارہ اس ستم ایجاد کا

اب تو وہ بھی لوٹ ہے بلبل تری آواز پر
بارک اللہ خوب پھانسا تو نے دل صیاد کا

اس کے صدقے جائیے جس نے تجھے پیدا کیا
شکل دی حور و پری کی دل دیا جلاد کا

وصل میں کیسا ادب اے جانِ گستاخی معاف
آج لینا ہے مجھے تم سے عوض بیداد کا

آپ بھی خنجر بکف ہیں میں بھی ہوں سینہ سپر
رہ نہ جائے آج کوئی حوصلہ بیداد کا

مجکو ہے ایسا چمن درکار جس میں اے جلیلؔ
خوف گلچیں کا نہ ہو کھٹکا نہ ہو صیاد کا

رک گیا چل کے ہاتھ قاتل کا
ہوگیا خون حسرت دل کا

کون آیا کہ مثل پروانہ
اڑ گیا رنگ شمعِ محفل کا

سُرخ ہوں کیوں نہ پھول گلشن کے
جو سمجھتے ہیں لہو عنا دل کا

روئے قاتل میں کب یہ سرخی تھی
رنگ لایا ہے خون بسمل کا

کہہ رہی ہے یہ آنکھ ساقی کی
میرے دم سے ہے رنگ محفل کا

آنکھ رہزن نہیں تو پھر کیا ہے
لوٹ لیتی ہے قافلہ دل کا

تم یہاں تھے تو محو صورت تھا
اب تصور ہے مشغلہ دل کا

اُٹھتے دیکھا جو تم کو پہلو سے
درد بھی اُٹھ کھڑا ہوا دل کا

وضعداری کی شان ہے یہ جلیلؔ
رنگ بدلا نہ عمر بھر اپنا

ایسے چھپنے سے نہ چھپنا ہی تھا بہتر تیرا
تو ہے پردے میں مگر ذکر ہے گھر گھر تیرا

پانی پانی مری توبہ ہو نہ کیوں اے ساقی
دیکھ پایا ہے چھلکتا ہوا ساغر تیرا

شمع سے چاند سوا چاند سے خورشید سوا
اور ان سب سے سوا ہے رُخِ انور تیرا

دورِ مے دیکھ کے حیرت ہے مجھے اے ساقی
چلتے چلتے کبھی تھکتا نہیں ساغر تیرا

یہی دو کام محبت نے دیے ہیں ہم کو
دل میں ہے یاد تری ذکر ہے لب پر تیرا

ساقیا زاہد بدبیں کی نظر ہے ہشیار
آنکھوں آنکھوں میں یہ پی جائے گا ساغر تیرا

سختیاں لاکھ ہوں سہنے کے لیے حاضر ہوں
میں بھی شیشے کا نہیں دل ہے جو پتھر تیرا

ساقیا گردشِ قسمت سے عوض لینا ہے
چاہتا ہوں کہ رہے دَور میں ساغر تیرا

آجکل آئینہ والوں میں گزرتی ہے جلیل
بارک اللہ نصیبا ہے سکندر تیرا

مری نظر نے عجب کارِ لاجواب کیا
کہ تجھ کو لاکھ حسینوں میں انتخاب کیا

نگاہِ لطف و عنایت سے فیضیاب کیا
مجھے حضور نے ذرے سے آفتاب کیا

چمن سے ہو کے جدا بوئے گل یہ کہتی ہے
صبا نے چل کے مجھے خانماں خراب کیا

گناہ کر کے بھی ہم رندِ پاک صاف رہے
شراب پی تو ندامت نے آب آب کیا

نہ باغباں کا ہے شکوہ، نہ شکوۂ صیاد
شکستہ بال و پری نے مجھے خراب کیا

چھلک چھلک کے ترے جام مے نے اے ساقی
ستم کیا مری توبہ کو آب آب کیا

مجھے یہ ناز کہ ہوں اس کا چاہنے والا
خدا نے حسن میں جس بت کو لاجواب کیا

وہ میری لاش پہ آئے ہیں یہ گلہ کرنے
کہ تیرے خون نے دامن مرا خراب کیا

جلیلؔ کیا کہوں ترکِ شراب کا انجام
جلا کے آتشِ غم نے مجھے کباب کیا

اس کا جلوہ جو کوئی دیکھنے والا ہوتا
وعدۂ دید قیامت پہ نہ ٹالا ہوتا

بام پر تھے وہ کھڑے لطف دوبالا ہوتا
مجھکو بھی دل نے اچھل کر جو اچھالا ہوتا

کیسے خوشرنگ ہیں زخم جگر و داغِ جگر
ہم دکھاتے جو کوئی دیکھنے والا ہوتا

دل نہ سنبھلا تھا اگر دیکھ کے جلوہ اس کا
تو نے اے دردِ جگر اٹھ کے سنبھالا ہوتا

تم جو پردے میں سنورتے ہو نتیجہ کیا ہے
لطف جب تھا کہ کوئی دیکھنے والا ہوتا

تم نے ارمان ہمارا نہ نکالا نہ سہی
اپنے خنجر کا تو ارمان نکالا ہوتا

دل کے ہاتھوں نہ ملا چین کسی روز جلیلؔ
ایسے دشمن کو نہ آغوش میں پالا ہوتا

دیر میں آیا تو کیا قاصد شباب آیا تو کیا
ان کو آنا چاہیئے خط کا جواب آیا تو کیا

آنکھ بھی ساقی ملاتا جا خدا کے واسطے
دور میں خالی اگر جام شراب آیا تو کیا

بات کو آکر جو تم ملتے تو ہاں اک بات تھی
صبح کو صورت دکھانے آفتاب آیا تو کیا

عشق میں ہونی تھی رسوائی جہاں تک، ہو چکی
اب مرے بس میں دلِ خانہ خراب آیا تو کیا

عمر گزری ہے مرے دل کو تڑپتے لوٹتے
برق کے حصے میں دم بھر اضطراب آیا تو کیا

رات کو سونا نہ سونا سب برابر ہو گیا
تم نہ آئے خواب میں آنکھوں میں خواب آیا تو کیا

تابِ نظّارہ نہیں میری نظر کو اے جلیلؔ
بے نقاب آیا تو کیا وہ با نقاب آیا تو کیا

عہدِ شباب چشمِ زدن میں گزر گیا
جھونکا ہوا کا تھا اِدھر آیا اُدھر گیا

خالی گئی نہ چوٹ خدنگِ نگاہ کی!
دل اس سے بچ گیا تو جگر میں اتر گیا

ایسا نہ جانتا تھا دلِ بے وفا کو میں
کمبخت خود گیا مجھے بدنام کر گیا

دو دن کی ہے بہار حسینوں کا التفات
نظروں پہ جو چڑھا وہی دل سے اتر گیا

اشکوں کے ساتھ لختِ جگر بھی مجھے ملے
لعل و گہر سے دامنِ اُمید بھر گیا

آیا نہ پھر کے ایک بھی کوچے سے یار کے
قاصد گیا، نسیم گئی، نامہ بر گیا

مجھ سا بھی بے خبر نہ کہیں ہوگا اے جلیلؔ
اتنی خبر نہیں کہ مرا دل کدھر گیا

شوخی نے دلربا کو دل آزار کردیا
غمزے کو تیر ناز کو تلوار کردیا

کہتا ہے دل یہ آنکھ سے او محوِ انتظار
تو نے مجھے بلا میں گرفتار کردیا

صورت تو ابتدا سے تری لاجواب تھی
ناز و ادا نے اور طرحدار کردیا

مطلب یہ تھا کہ لوگ مسیحا کہیں انہیں
خود چارہ گر بنے مجھے بیمار کردیا

مشتاق تو کیا تھا ترے حسن نے مجھے
پردے نے اور طالبِ دیدار کردیا

اب غرق ہوں میں آٹھ پہر مے کی یاد میں
توبہ نے مجھکو اور گنہگار کردیا

کیا اعتبار وعدۂ معشوق کا جلیلؔ
منہ سے ابھی کہا ابھی انکار کردیا

مثلِ پروانہ فدا ہر ایک کا دل ہو گیا
یار جس محفل میں بیٹھا شمعِ محفل ہو گیا

وعدہ کر کے اور بھی آفت میں ڈالا آپ نے
زندگی مشکل تھی اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

سچ یہ کہتے ہیں کہ صحبت میں بڑی تاثیر ہے
میرے قاتل کا ہر اک انداز قاتل ہو گیا

خوب نظارہ کی سوجھی اے دلِ حیراں تجھے
آئینہ بن کر حسینوں کے مقابل ہو گیا

دن جدائی کا نہیں کاٹے سے کٹتا اے جلیلؔ
یہ بھی سختی میں کسی معشوق کا دل ہو گیا

ترا جلوہ مجھے بیخود بنا جاتا تو کیا ہوتا
جگر میں دل میں آنکھوں میں سما جاتا تو کیا ہوتا

تری آنکھوں کا جادو سوتے فتنوں کو جگاتا ہے
ہمارے بخت خفتہ کو جگا جاتا تو کیا ہوتا

کدھر جاؤں کہاں ڈھونڈوں میں اپنے گمشدہ دل کو
اگر ظالم پتہ اپنا بتا جاتا تو کیا ہوتا

تصور میں تو آنا یار کا ہر روز ہوتا ہے
مرے پہلو میں دم بھر کو جو آ جاتا تو کیا ہوتا

جلیلؔ اس کے تصور سے تو اپنے ہوش جاتے ہیں
کہیں وہ اِک جھلک اپنی دکھا جاتا تو کیا ہوتا

ہائے دم بھر بھی دل ٹھہر نہ سکا
ہاتھ سینے پہ کوئی دھر نہ سکا

آئینہ کس سے دیکھا جاتا ہے
رشک کے مارے وہ سنور نہ سکا

رہ گیا آنکھ میں نزاکت سے
دل میں نقشہ ترا اتر نہ سکا

اس جہاں سے گزر گئے لاکھوں
اس گلی سے کوئی گزر نہ سکا

میکشی سے نجات مشکل ہے
مے کا ڈوبا کبھی اُبھر نہ سکا

میرا نامہ خط مقدر تھا
کہ نظر سے تری گزر نہ سکا

جو ترے عشق میں تباہ ہوا
کوئی اس کو کوئی تباہ کر نہ سکا

آگ ایسی لگی تھی سینے میں
آنکھ سے دل میں وہ اتر نہ سکا

موسم گل میں بھی جلیل افسوس
دامن اپنا گلوں سے بھر نہ سکا

دل ہے اپنا نہ اب جگر اپنا
کر گئی کام وہ نظر اپنا

اب تو دونوں کی ایک حالت ہے
دل سنبھالوں کہ میں جگر اپنا

میں ہوں گو بے خبر زمانے سے
دل ہے پہلو میں باخبر اپنا

دل میں آئے تھے سیر کرنے کو
رہ پڑے وہ سمجھ کے گھر اپنا

تھا بڑا معرکہ محبت کا
سر کیا میں نے دے کے سر اپنا

اشکباری نہیں یہ در پردہ
حال کہتی ہے چشمِ تر اپنا

کیا اثر تھا نگاہِ ساقی میں
نشہ اُترا نہ عمر بھر اپنا

چارہ گر دے مجھے دوا ایسی
درد ہو جائے چارہ گر اپنا

وضعداری کی شان ہے یہ جلیل
رنگ بدلا نہ عمر بھر اپنا

حسن و الفت میں خدا نے ربط پیدا کر دیا
دردِ دل مجھکو دیا تم کو مسیحا کر دیا

خوب کی تقسیم تو نے اے خیالِ زلفِ یار
دل کو نذرِ داغ سر کو وقفِ سودا کر دیا

جان لے لینا جلانا کھیل ہے معشوق کا
آنکھ سے مارا لبِ نازک سے زندا کر دیا

مجھکو شکوہ ہے کہ دل کا خون قاتل نے کیا
دل یہ کہتا ہے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

ناز ہو یا دلبری افسوں ہو یا جادوگری
سب کو قدرت نے تری چتون کا حصا کر دیا

دل ادھر رخصت ہوا ہوش اس طرف چلتے ہوئے
کس کی آنکھوں نے یہ درپردہ اشارا کر دیا

میں کہاں چاہت کہاں یہ سب کرشمے دل کے ہیں
تم پہ خود شیدا ہوا مجھکو بھی شیدا کر دیا

مرحبا اے ساقیِ جادو نظر صد مرحبا
مست آنکھوں نے ہر اک نشہ دوبالا کر دیا

دل تڑپتا ہے تو کچھ تسکین ہوتی ہے جلیلؔ
جی بہلنے کو خدا نے درد پیدا کر دیا

کھلے جو گل تو مجھے شوقِ گلعذار ہو
بہار آتے ہی سودا گلے کا ہار ہو

خیالِ زلف میں وحشت سے ہمکنار ہوا
بچھا وہ دام کہ مرغِ جنوں شکار ہوا

خدنگِ ناز کی میں روک تھام کیا کرتا
مجھے خبر بھی نہیں کب جگر کے پار ہوا

پسِ وصال بھی ہے مستیِ وصال وہی
بہار ختم ہوئی میں نہ ہوشیار ہوا

یہ حسن و عشق کی باہم مناسبت دیکھو
وہ دھان پان ہوئے میں نحیف و زار ہوا

یہ سادگی ہے کہ زینت کا ان کو ہوش نہیں
یہ نازکی ہے کہ رنگِ حنا بھی بار ہوا

عجیب خوگرِ آزارِ دل ملا ہے مجھے
گھٹا جو دردِ جگر اور بے قرار ہوا

وہی ہے رنگ ابھی تک جگر کے داغوں کا
یہاں جو پھول کھلا وہ سدا بہار ہوا

کوئی ادا میں کوئی حسن میں ہوا مشہور
جلیلؔ عشق میں یکتائے روزگار ہوا

چل پھر کے تم نے رنگ چمن کا بڑھا دیا
غنچے کو پھول پھول کو گلشن بنا دیا

شب بھر رہا یہ حال ترے انتظار میں
جھپکی جو آنکھ دل نے تڑپ کر جگا دیا

دل دے دیا نظر کو جگر تیر ناز کو
دونوں کو آج ہم نے ٹھکانے لگا دیا

ساقی کے دم سے باغ میں ہے میکدے کا رنگ
جس گل پہ آنکھ پڑ گئی ساغر بنا دیا

ناوک تو اور بھی تھے مرے دل کی تاک میں
تیرِ نظر نے بڑھ کے نشانہ اڑا دیا

جی چاہتا ہے پھر کوئی تجھ سے کروں سوال
تیری نہیں نہیں نے غضب کا مزا دیا

دلبر کا شکوہ کیجئے یا دل کو روئیے
دونوں نے مل کے خاک میں مجھکو ملا دیا

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا

آنکھوں کا ہے یہ رنگ محبت میں اے جلیل
پوچھا کسی نے حال تو دریا بہا دیا

یہ گل کھلا ہے نیا باغ آشنائی کا
کہ دل بھی داغ مجھے دے گیا جدائی کا

بری بہار میں عالمِ خزاں کا رہتا ہے
ہوا جو وصل تو کھٹکا رہا جدائی کا

ابھی ہے موسمِ گل چھوڑ دے مجھے صیاد
گئی بہار تو پھر لطف کیا رہائی کا

ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں
نیا نیا ہے ابھی شوق دلربائی کا

ہزار رنگ بدلتا ہے آسماں لیکن
شبِ وصال سے بدلا نہ دن جدائی کا

بلا کا زور تھا تیری شراب میں ساقی
غرور توڑ دیا جس نے پارسائی کا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

نگاہِ بد سے بچائے رہے خدا تم کو
ادا کی دھوم ہے شہرہ ہے دلربائی کا

جلیلؔ دل کی حفاظت ضرور ہے ورنہ
یہ مٹ کے نام مٹا دے گا آشنائی کا

ہے ستم ناز سے آنا سرِ مدفن تیرا
خاک اڑ کر نہ کہیں تھام لے دامن تیرا

تجھکو شکوہ ہے کہ عشاق نے بدنام کیا
سچ تو یہ ہے کہ ترا حسن ہے دشمن تیرا

سن جو کم ہے تو زیادہ ہے ستم کا پیکا
قتل کو کھیل سمجھتا ہے لڑکپن تیرا

چاہتا ہوں کہ جنوں میں یہ اثر پیدا ہو
میں کروں جامہ دری چاک ہو دامن تیرا

پیش خیمہ ہیں قیامت کے یہی دو فتنے
باڑھ پر قد ہے ترقی پہ ہے جوبن تیرا

گھر ہمیشہ ترے آئینے کا آباد رہے
جس میں جلتا ہے چراغِ رخِ روشن تیرا

خار ہیں ہم جو نظر میں تو چلے جاتے ہیں
باغباں تجھکو مبارک رہے گلشن تیرا

وہ حنا ہاتھ میں ملتے ہیں ادا کہتی ہے
سرخرو دوست ہو پامال ہو دشمن تیرا

کیا شگفتہ گل اشعار ہیں دیواں میں جلیلؔ
تر و تازہ رہے تا حشر یہ گلشن تیرا

وہ رنگ ہے بہار میں جام شراب کا
جیسے کسی حسین پہ عالم شباب کا

رُخ پر اگر نقاب پڑی ہے پڑی رہے
ہم لوٹتے ہیں دیکھ کے عالم نقاب کا

رندوں کو مے سے اتنی عقیدت تو چاہیئے
دل کی جگہ بغل میں ہو شیشہ شراب کا

مجھ کو بھی اپنے ساتھ ملاتا ہے خاک میں
خانہ خراب ہو دلِ خانہ خراب کا

توبہ کے توڑنے میں یہ پتھر سے کم نہیں
نازک ہے دیکھنے میں جو شیشہ شراب کا

ٹھہرا ہے دل تو یہ نہ سمجھنا ٹھہر گیا
تھم تھم کے لے رہا ہے مزہ اضطراب کا

مستانہ ہر نگاہ ہے مستانہ ہر ادا
ساقی بنو جو تم تو مزہ ہے شراب کا

شوخی سے اب تو آپ کو دم بھر نہیں قرار
کچھ رنگ آچلا ہے مرے اضطراب کا

اک مست ناز کا جو تصور ہے اے جلیلؔ
رہتا ہے بے پیئے مجھے نشہ شراب کا

اس ادا سے وہ فتنہ گر نکلا
دل گیا ہاتھ سے جگر نکلا

دل کو نالے کا اک سہارا تھا
وہ بھی قسمت سے بے اثر نکلا

ہوش آنے کا تھا جو خوف مجھے
میکدے سے نہ عمر بھر نکلا

چارہ گر کی تلاش تھی بیکار
دردِ دل اپنا چارہ گر نکلا

تیرِ قاتل کی پیاس کیا بجھتی
خونِ دل میں نہ بوند بھر نکلا

ہم سمجھتے تھے جس کو دل اپنا
کسی پردہ نشیں کا گھر نکلا

خار جتنے چبھے تھے سب نکلے
دل کا کانٹا نہ عمر بھر نکلا

ہائے دیکھا نہ تجھ کو جی بھر کے
حشر کا دن بھی مختصر نکلا

میکشی ہے جلیلؔ کو زیبا
بے خبر ہو کے باخبر نکلا

ہمارے قتل سے قاتل نے خوب نام کیا
یہ خوب ہے کہ ادا نے قضا کا کام کیا

بلائے ہجر سے بچنے کی کون صورت ہے
گلے پڑی شبِ فرقت جو دن تمام کیا

وہ آنکھ ملتے ہی سب دل کا حال جان گئے
غضب کیا کہ نظر نے زباں کا کام کیا

نظر کی چوٹ سے گر بچ گیا شکار کوئی
تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیرِ دام کیا

ہوا نباہ نہ ترکِ شراب کا مجھ سے
بہار آتے ہی توبہ کو نذرِ جام کیا

گری وہ برقِ تجلّی کہ لاکھوں لوٹ گئے
نکل کے آپ نے پردے سے قتلِ عام کیا

پیام ان کا جو آیا کہ ہم نہیں آتے
تو اٹھ کے دردِ جگر نے مجھے سلام کیا

وہ دل میں آ کے نکلتے نہیں ہیں پھر دل سے
وہیں کے ہو رہے دم بھر جہاں قیام کیا

جلیلؔ رازِ محبت جو تم چھپاتے ہو
کچھ اپنے دیدۂ و دل کا بھی انتظام کیا

ناشاد رہ گیا نہ کوئی شاد رہ گیا
چرچا ستم کا او ستم ایجاد رہ گیا

آساں نہیں ہے کوچۂ دلبر کو چھوڑنا
اُٹھ کر جو میں چلا دلِ ناشاد رہ گیا

آیا تھا شوق سے تری تصویر کھینچنے
تصویر ہو کے آپ ہی بہزاد رہ گیا

وعدے کے ساتھ شرط یہ اچھی ہے آپکی
وعدہ وفا کریں گے اگر یاد رہ گیا

شرم و حیا سے نام نہ روشن ہوا ترا
زیرِ نقاب حسنِ خداداد رہ گیا

کانٹا نکل سکا نہ دلِ عندلیب سے
گلچیں گیا چمن سے تو صیاد رہ گیا

میں بیخودی میں بھول گیا سب کو اے جلیلؔ
قدرت خدا کی ہے کہ وہ بت یاد رہ گیا

دامن جو چھو لیا ہے کسی گلعذار کا
ملتا نہیں مزاج نسیم بہار کا

وہ آئیں یا نہ آئیں کچھ اس سے غرض نہیں
آنکھوں کو پڑ گیا ہے مزہ انتظار کا

غنچوں کو چھیڑتی ہے ہنسانے کے واسطے
کیا شوخ ہے مزاج نسیم بہار کا

وعدے کا اعتبار تو اے یار ہے مگر
کیا اعتبارِ زندگیِ مستعار کا

مستی مری بہار پہ کچھ منحصر نہیں
ساقی کے دم سے روز ہے موسم بہار کا

آمد یہاں جنوں کی ہے رخصت حواس کی
دونوں کو انتظار ہے فصلِ بہار کا

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

صیاد مجھکو آپ اسیری کا شوق ہے
اتنا ٹھہر کہ ختم ہو موسم بہار کا

ان گلرخوں کا دور ہوا جب سے اے عبیرؔ
نقشہ بدل گیا چمن روزگار کا

حوصلہ وصل کا قسمت نے نکلنے نہ دیا
ان کو شوخی نے مجھے دل نے سنبھلنے نہ دیا

قتل کر کے مجھے جانا تھا انھیں مقتل سے
آپ چلتے ہوئے تلوار کو چلنے نہ دیا

جام پر جام پلاتی رہی چشمِ ساقی
مجکو اس دورِ مسلسل سے سنبھلنے نہ دیا

اپنی شوخی پہ بہت ناز تھا ان کو لیکن
میں نے آغوشِ تصوّر سے نکلنے نہ دیا

میں تری بزم سے بے داغ لیے جاتا ہوں
شمع کو تو نے جلایا مجھے جلنے نہ دیا

کس قدر جلد ہوئی ختم جوانی کی بہار
نخلِ اُمّید مرا پھولنے پھلنے نہ دیا

غیر ممکن تھا کہ اس گھر میں وہ تنہا رہتے
کسی ارماں کو مرے دل سے نکلنے نہ دیا

لب بلب ہو کے عجب کام کیا ساغر نے
لفظ ''تو بہ'' کا مرے منھ سے نکلنے نہ دیا

وہی راتیں ہیں جُدائی کی، وہی دن ہیں جلیلؔ
اس زمانے کو زمانے نے بدلنے نہ دیا

جا بجا پھرتے ہو کیوں شمس و قمر کی صورت
آؤ دل میں رہو آرام سے گھر کی صورت

روئے جاناں کا جوانی میں یہ عالم دیکھا
چودھویں رات کو جیسے ہو قمر کی صورت

محفلِ یار میں کیا رنگ جمائے کوئی
شمع جلتی ہے جہاں داغِ جگر کی صورت

کل جو تھے آپ تو جنت کا مزہ آتا تھا
آج دیکھی نہیں جاتی مرے گھر کی صورت

کوئی فتنہ نہ اٹھا فتنۂ قامت کی طرح
کوئی جادو نظر آیا نہ نظر کی صورت

اپنے بسمل کو وہ پوچھیں تو یہ کہنا قاصد
دیکھی جاتی نہیں اب زخمِ جگر کی صورت

صبحدم وہ جو مرے گھر سے چلے مثلِ نسیم
بجھ گیا دل کا کنول شمعِ سحر کی صورت

ہجرِ ساقی میں جو ساغر پہ نظر پڑتی ہے
دل بھر آتا ہے مرا دیدۂ تر کی صورت

اُس نے جس دل کو بنا رکھا تھا گھر اپنا جلیلؔ
اب وہی دل ہے اِک اُجڑے ہوئے گھر کی صورت

نازک مزاج ہو نہ کوئی یار کی طرح
کھنچتا ہے بات بات پہ تلوار کی طرح

سونے کا ہے خیال کسے اے شبِ وصال
جاگیں گے آج طالعِ بیدار کی طرح

گلشن میں تم نہیں تو گلوں کا یہ رنگ ہے
بیمار سب ہیں نرگسِ بیمار کی طرح

دل مفت چاہتے ہیں مگر سب کے سامنے
قیمت لگا رہے ہیں خریدار کی طرح

اس شوق میں کہ آپ کریں ہم کو پائمال
در پر پڑے ہیں سایۂ دیوار کی طرح

قسمت تو تھی پھری ہوئی مدت سے اے جلیل
کیا تو بھی پھر گئی نگہِ یار کی طرح

پردے کا ہے خیال تو صورت یہ خوب ہے
آنکھوں میں رہئے حسرتِ دیدار کی طرح

کیونکر نباہ دونوں میں ہوتا ہے دیکھئے
دل بھی مرا جدار ہے دلدار کی طرح

آئینہ دیکھتے ہیں وہ کس پیار سے جلیل
چمکا رہے ہیں اس کو بھی رخسار کی طرح

بے وفائی کا گلہ اے دلِ ناشاد نہ کر
جو تجھے بھول گیا تو بھی اسے یاد نہ کر

ناوکِ ناز سے کرتے ہیں کلیجا چھلنی
اور ارشاد یہ ہوتا ہے کہ فریاد نہ کر

میں قفس ہی کو سمجھ لوں گا نشیمن اپنا
تیری مرضی نہیں صیاد تو آزاد نہ کر

دل میں رہ کر یہ مری دل شکنی خوب نہیں
جس کو آباد کیا ہے اسے برباد نہ کر

ہدفِ تیرِ نظر غیر ہو میرے ہوتے
سب ستم کر یہ ستم او ستم ایجاد نہ کر

ابھی کچھ دیر ہے صیاد بہار آنے میں
اور دو روز قفس سے مجھے آزاد نہ کر

سب کو آزاد کیا خوب کیا اے صیاد
میں اسیری کا ہوں خوگر مجھے آزاد نہ کر

اس رہائی سے تو صیاد اسیری اچھی
بال و پر نوچ کے ظالم مجھے آزاد نہ کر

صبح کو رات کا افسانہ ہے بیکار جلیلؔ
عہدِ پیری میں جوانی کے مزے یاد نہ کر

ناز کرتا ہے جو تو حُسن میں یکتا ہو کر
میں بھی نازاں ہوں ترا عاشق شیدا ہو کر

میں نہ سمجھا تھا کہ اشکوں سے اُٹھے گا طوفاں
چند قطروں نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

چشمِ بیمار جو پہلے تھی وہی اب بھی ہے
کچھ بنائے نہ بنی تم سے مسیحا ہو کر

کس کے رخسار دمِ سیرِ چمن یاد آئے
پھول آنکھوں میں کھٹکنے لگے کانٹا ہو کر

درد تھا دل میں تو جینے کا مزہ ملتا تھا
اب تو بیمار سے بدتر ہوں میں اچھا ہو کر

دام سے چھوٹ کے بھی میری اسیری نہ گئی
زلفِ صیاد گلے پڑ گئی پھندا ہو کر

چھپ کے رہنا ہے جو سب سے تو یہ مشکل کیا ہے
تم مرے دل میں رہو دل کی تمنا ہو کر

کیا ستم ہے شبِ وعدہ وہ حنا ملتے ہیں
رنگ لائے نہ کہیں خونِ تمنا ہو کر

دہنِ یار کی تعریف جو کی میں نے جلیلؔ
اڑ گیا طائرِ مضموں مرا عنقا ہو کر

دل کے سب داغ کھلے ہیں گلِ خنداں ہو کر
رنگ لایا ہے یہ غنچہ چمنستاں ہو کر

دامن تر ہے کہ دفتر ہے یہ رسوائی کا
میری آنکھوں نے ڈبویا مجھے گریاں ہو کر

نیند آئی جو کبھی زلف کے دیوانے کو
چونک اٹھا خواب پریشاں سے پریشاں ہو کر

نگہِ شوق تو در پردہ خبر لیتی ہے
آپ جائیں گے کہاں آنکھ سے پنہاں ہو کر

جلوہ گر آئینہ خانے میں ہوا کون حسیں
نقشِ دیوار ہیں سب آئینے حیراں ہو کر

دل میں آئے ہیں تو اب دل سے نکلتے ہی نہیں
گھر پہ قبضہ کیے بیٹھے ہیں وہ مہماں ہو کر

شہرۂ حسن ابھی کیا ہے شباب آنے دو
نام چمکے گا تمہارا مہِ تاباں ہو کر

قتل کے بعد وفا میری جو یاد آئی ہے
سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہیں پشیماں ہو کر

مست آنکھوں پہ بکھر جاتی ہے جب زلف جلیلؔ
میں سمجھتا ہوں گھٹا چھائی ہے میخانوں پر

آپ بن ٹھن کے جو ہوتے ہیں خراماں ہر روز
چاک ہو جاتے ہیں دو چار گریباں ہر روز

موسم گل میں نئے رنگ کی وحشت ہے مجھے
سیرِ گلشن ہے کبھی سیرِ بیاباں ہر روز

زخم جو تیغِ تبسّم سے دیے ہیں تم نے
صورتِ گل وہ نظر آتے ہیں خنداں ہر روز

یار آئے کہ نہ آئے یہ مقدر اپنا
ہم تو کرتے ہیں یہاں وصل کا ساماں ہر روز

اپنے موسم پہ مزہ دیتی ہے برسات جلیلؔ
کیوں برستے ہیں ترے دیدۂ گریاں ہر روز

وہ اپنے گھر سے چلے ہیں مرے مکاں کی طرف
بہار آئی ہے بلبل کے آشیاں کی طرف

جو تھی بہار تو گاتے رہے بہار کا راگ
خزاں جو آئی تو ہم ہو گئے خزاں کی طرف

ذرا سی بات میں قصّہ تمام ہوتا ہے
ادا سے دیکھ لو اک بار نیم جاں کی طرف

بلائے تازہ کوئی آج آنے والی ہے
کیا ہے اس نے اشارہ کچھ آسماں کی طرف

جلیلؔ سب کا ہوا خواہ ہے گلستاں میں
نہ بلبلوں کی طرف ہے نہ باغباں کی طرف

وہ خوشنما ہے ترے روئے لاجواب کا رنگ
بہار جس پہ تصدق کرے گلاب کا رنگ

بہار حسن سے پردا اٹھا لڑکپن کا
ادا ادا سے ٹپکنے لگا شباب کا رنگ

یہ فیض صحبتِ عارض نہیں تو پھر کیا ہے
کہ دیدنی ہے رخِ یار پر نقاب کا رنگ

بہار عارض پُرنور روز افزوں ہے
کہ پہلے چاند کا تھا اب ہے آفتاب کا رنگ

نگاہ شوخ سے بے چین دل یہ کہتا ہے
کہ تو نے چھین لیا میرے اضطراب کا رنگ

وہ رنگ یار کا صبح شب وصال ہوا
کہ جیسے رات گزرنے پہ ماہتاب کا رنگ

ابھی تھی شام ابھی صبح ہو گئی روشن
اڑا لیا ہے شب وصل نے شباب کا رنگ

جلیلؔ عشق کی تاثیر اس کو کہتے ہیں
کہ اشکِ بلبلِ شیدا میں ہے گلاب کا رنگ

حسن یہ ہے کہ دلربا ہو تم
عیب یہ ہے کہ بےوفا ہو تم

تم سمجھتے ہو چرخ کو ظالم
میں سمجھتا ہوں کچھ سوا ہو تم

جانتے ہیں تمھارے شیدائی
تم نہیں جانتے کہ کیا ہو تم

تم کو زیبا ہے جان و دل لینا
خوبصورت ہو خوش ادا ہو تم

ہے جبھی لطف آشنائی کا
کاش کچھ درد آشنا ہو تم

سچ ہے یا جھوٹ لوگ کہتے ہیں
فتنہ پرور ہو فتنہ زا ہو تم

مدعا پوچھتے ہیں وہ میرا
کہہ دے قاصد کہ مدعا ہو تم

جب وہ ملتے ہیں پوچھتے ہیں جلیل
سچ کہو کس پہ مبتلا ہو تم

یا خُدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جس پہ مرتا ہوں اُسے میری خبر ہے کہ نہیں

مجھ سے ارشاد یہ ہوتا ہے کہ تڑپا نہ کرو
کچھ تمھیں اپنی اداؤں پہ نظر ہے کہ نہیں

آج تقدیر بھی کمبخت پڑی سوتی ہے
کس سے پوچھوں شبِ فرقت کی سحر ہے کہ نہیں

دیکھ لی تم نے مرے دل کی تڑپ سچ کہنا
کچھ تمھیں بھی خلشِ دردِ جگر ہے کہ نہیں

روز ہم تجھ سے تصور میں گلے ملتے ہیں
بے خبر کچھ تجھے اپنی بھی خبر ہے کہ نہیں

او نگاہوں سے زمانے کو لٹانے والے
میری قسمت کا کوئی تیرِ نظر ہے کہ نہیں

آپ سے آنکھ ملاؤں یہ مری طاقت ہے
دیکھتا یہ ہوں کہ اگلی سی نظر ہے کہ نہیں

اپنے دامن سے نہ اس سے کبھی آنسو پونچھے
ڈوب مرنے کی جگہ دیدۂ تر ہے کہ نہیں

سچ تو کہتا ہے ترا ناصحِ غمخوار جلیل
مجھ کو انجامِ محبت پہ نظر ہے کہ نہیں

میں کسی اور سے کیوں شکوۂ بیداد کروں
بات جب ہے کہ تجھی سے تری فریاد کروں

رحم آیا ہے نہ آئے گا کبھی قاتل کو
میں کہاں تنگ دہن زخم سے فریاد کروں

دو گھڑی چین سے رہنے کی یہی صورت ہے
تجھ کو قاتل کے حوالے دلِ ناشاد کروں

مست کر دے مجھے ساقی مگر اس شرط کے ساتھ
ہوش اتنا رہے باقی کہ تجھے یاد کروں

تازہ کرتا ہے مرے زخمِ کہن کو صیاد
مجھ سے کہتا ہے بہار آئے تو آزاد کروں

دل تو کہتا ہے غمِ عشق کا اظہار نہ ہو
دردِ دل کا یہ تقاضا ہے کہ فریاد کروں

مجھ کو مدت ہوئی رہتے ہوئے گلشن میں جلیل
چل کے اب خانۂ صیاد کو آباد کروں

ساقیا دیر نہ کر کشتیِ مے لانے میں
جان پیاسوں کی پڑی ہے ترے پیمانے میں

میں سمجھتا ہوں اسی کو دلِ مضطر کا علاج
تو نہ اے درد کمی کر مرے تڑپانے میں

دردِ دل ہو گا مرے دیدۂ تر سے ظاہر
جو ہے شیشے میں وہی آئے گا پیمانے میں

یوں تو جل بجھنے میں دونوں ہیں برابر لیکن
وہ کہاں شمع میں جو آگ ہے پروانے میں

ساقیِ توبہ شکن فصلِ بہار آنے دے
خون توبہ کا بھریں گے ترے پیمانے میں

میکدے کی یہ ادا اس سے نہیں دیکھی جاتی
نہیں معلوم ہے کیا دیر بہار آنے میں

چھوڑ کر خانۂ زنجیر کو پچھتاتا ہوں
جی بہلتا ہے نہ گلشن میں نہ ویرانے میں

ساقیا دیدۂ پر خوں کی خبر تجھ کو نہیں
مئے گلرنگ بھری ہے مرے پیمانے میں

میرے کہنے کا یقیں تم کو نہ آئے گا جلیلؔ
چل کے جنت کا سماں دیکھ لو میخانے میں

اِک برق وش کو دیکھ رہوں اضطراب میں
آنکھوں نے مجھکو ڈال دیا کس عذاب میں

کہہ دو یہ نیند سے کہ نہ آئے شبِ فراق
تل بھر جگہ نہیں مرے چشمِ پر آب میں

وہ چاندنی میں پھرتے ہیں گھر گھر یہ شور ہے
نکلا ہے آفتاب شبِ ماہتاب میں

وہ منہ چھپائے بیٹھے ہیں جلتا ہے جی مرا
اے برق آہ آگ لگا دے نقاب میں

دنیا کا رنگ دیکھ کے ہم چونکتے نہیں
آنکھیں تو جاگتی ہیں مگر دل ہے خواب میں

پھر دل میں اس کی یاد نے نشتر چبھو دیا
پھر کچھ کمی ہوئی تھی مرے اضطراب میں

تھوڑی سی نیند مانگ لے قسمت سے چشمِ شوق
وعدہ وہ کر گئے ہیں کہ آئیں گے خواب میں

زاہد تجھے ہے زہد میں جس چیز کی تلاش
وہ ہے پڑی ہوئی مرے جامِ شراب میں

روزِ حساب آئے جو نوبت جلیل کی
یارب کمی نہ ہو کرم بے حساب میں

سچ ہے کہ پارسا کوئی جادو نظر نہیں
دل لے گیا وہ چھین کے مجھ کو خبر نہیں

دو روز میں مزاج کا رنگ اور ہو گیا
آنکھیں تری وہی ہیں مگر وہ نظر نہیں

کس سے کہوں کہ جا کے خبر لائے یار کی
قاصد نہیں، نسیم نہیں، نامہ بر نہیں

نکلا ہوں اس طرح میں تری جلوہ گاہ سے
دل مجھ سے بے خبر مجھے دل کی خبر نہیں

کمسن ہو تم حسین ہو تم دلربا ہو تم
تم کو ستم روا ہے مگر اس قدر نہیں

چلتی ہے ساتھ ساتھ قضا بن کے رہنما
تنہا تری گلی میں کسی کا گذر نہیں

بیٹھے ہیں بے نقاب جو وہ بزم میں جلیل
سب محو ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

میری آنکھوں سے مرے یار کا جلوا دیکھو
چشمِ مجنوں سے بہارِ رخِ لیلیٰ دیکھو

آتشِ عشق سے کیونکر میں بچاؤں دامن
دل تو کہتا ہے کہ گھر پھونک تماشا دیکھو

تم حنا جان کے مَلتے ہو اسے ہاتھوں میں
رنگ لائے نہ کہیں خونِ تمنا دیکھو

آنکھ بجلی سے لڑانا کوئی آسان نہیں
یار کے دیکھنے والوں کا کلیجا دیکھو

ناوکِ ناز سے کرتے ہو جو روزن دل میں
راہ پا کر نہ نکل جائے تمنا دیکھو

نگہِ شوق سے بیکار خفا ہوتے ہو
آئینہ لے کے ذرا حسن کا جلوا دیکھو

جان لینے میں مری جان کوئی لطف نہیں
نیم جاں چھوڑ کے بسمل کا تماشا دیکھو

دیکھ کر ایک نظر قتل کیا ہے تم نے
جان آ جائے اگر مڑ کے دوبارا دیکھو

اشک آنکھوں میں ہے سوزش ہے کلیجے میں جلن
دل لگانے کا یہ ہوتا ہے نتیجا دیکھو

عشق کرنا تھا نہ تجھکو نگہِ یار کے ساتھ
کھیلتا ہے دلِ ناداں کوئی تلوار کے ساتھ

رشکِ یوسف ہو طرحدار ہو دلدار ہو تم
ناز کرنا تمھیں زیبا ہے خریدار کے ساتھ

وصل کی رات خوشی نے مجھے سونے نہ دیا
میں بھی بیدار رہا طالعِ بیدار کے ساتھ

اے جنوں کوچۂ دلدار کو چھوڑوں کیونکر
ہو گئی ہے مجھے الفت درو دیوار کے ساتھ

چشمِ جاناں کو مرے دل سے وہی نسبت ہے
جس طرح انس ہو بیمار کو بیمار کے ساتھ

شربتِ دید بھی کیا مے کا اثر رکھتا ہے
ہوش اڑ جاتے ہیں ظالم ترے دیدار کے ساتھ

سرفرازی کسے ہوتی درِ جاناں پہ جلیل
ہم بھی پامال رہے سایۂ دیوار کے ساتھ

عصمت کا ہے لحاظ نہ پروا حیا کی ہے
یہ سن غضب کا ہے یہ جوانی بلا کی ہے

سچ پوچھئے تو نالۂ بلبل ہے بے خطا
پھولوں میں ساری آگ لگائی صبا کی ہے

دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں
رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

خلوت میں کیوں یہ ساتھ ہیں سب کو الگ کرو
شوخی کا ہے نہ کام نہ حاجت حیا کی ہے

وہ ہاتھ ان کے چومتی ہے میں ہوں پائمال
یہ ہیں مرے نصیب وہ قسمت حنا کی ہے

انجام کیا ہو داغِ محبت کا دیکھئے
سینے میں ابتدا سے جلن انتہا کی ہے

موسم یہی تو پینے پلانے کا ہے جلیلؔ
میخوار باغ باغ ہیں آمد گھٹا کی ہے

تلوار کھینچ کے پنجۂ قاتل میں رہ گئی
بسمل کی آرزو دلِ بسمل میں رہ گئی

پھرتی رہی نگاہ میں تصویر یار کی
آخر اُتر کے آنکھ سے وہ دل میں رہ گئی

جھونکا جب آگیا کوئی مجنوں کی آہ کا
لیلیٰ تڑپ کے پردۂ محمل میں رہ گئی

اے یار تیری نیم نگاہی کے میں نثار
کچھ آرزو نکل گئی کچھ دل میں رہ گئی

جتنے تھے جاں نثار وہ سب ہو گئے نثار
رونق ہی رونق آپ کی محفل میں رہ گئی

سب کچھ ہم ان سے کہہ گئے لیکن یہ اتفاق
کہنے کی تھی جو بات وہی دل میں رہ گئی

یادِ وطن بھی ساتھ نہ غربت میں دے سکی
تھک کر غریب پہلے ہی منزل میں رہ گئی

کی شست و شو ہزار مگر پھر بھی اے جلیلؔ
رنگت لہو کی دامنِ قاتل میں رہ گئی

موسمِ گل ہے نہ رکھ قید میں صیّاد مجھے
ذبح کر ڈال جو کرتا نہیں آزاد مجھے

چھیڑتا کیوں ہے خدا کے لیے صیّاد مجھے
دو گرفتار ہوں آتی نہیں فریاد مجھے

یوں تو کاٹے نہیں کٹتی ہے جدائی کی گھڑی
کاش مل جائے کہیں تیشۂ فرہاد مجھے

کبھی بھولے سے جو آجاتی ہے نیند آنکھوں میں
چٹکیاں لے کے جگاتی ہے تری یاد مجھے

ساری دنیا کے خیالات تھے دل میں لیکن
جب سے ہے یاد تری کچھ بھی نہیں یاد مجھے

اچھی صورت نظر آتے ہی مچل جاتا ہے
کسی آفت میں نہ ڈالے دلِ ناشاد مجھے

شکر ہے کیوں نہ بدل جائے شکایت میری
لطف دینے لگی ظالم تری بیداد مجھے

اس زمانے میں کہاں یار وفادار جلیلؔ
دے گیا داغِ جدائی دلِ ناشاد مجھے

ساقی بھی ہے چمن بھی ہے ٹھنڈی ہوا بھی ہے
ٹوٹے جو آج توبہ تو اے دل مزا بھی ہے

آرام مل رہا ہے تڑپنے سے چارہ گر
جو درد ہے مرا وہی میری دوا بھی ہے

مہندی مرے لہو کی مبارک ہو آپ کو
رنگِ حنا بھی اس میں ہے بوئے وفا بھی ہے

رگ رگ پھڑک رہی ہے نیا رنگ دیکھ کر
قاتل بھی ہے چھری بھی ہے میرا گلا بھی ہے

زاہد کی طرح خشک مسلماں نہیں جلیلؔ
عشقِ بتاں بھی دل میں ہے یادِ خدا بھی ہے

ملتی نہیں کچھ اہلِ چمن کی خبر مجھے
لے چل اڑا کے تو ہی نسیمِ سحر مجھے

کس لطف کی نظر تھی لیا جس نے دل مرا
اب ڈھونڈتا ہوں ملتی نہیں وہ نظر مجھے

کب تک جلا کرے کوئی سوزِ فراق سے
اے کاش پھونک دے تری برقِ نظر مجھے

ناداں ہیں پوچھتے ہیں جو مجھ سے خبر تری
تیری خبر ہو کیا ، نہیں اپنی خبر مجھے

محوِ خیالِ یار ہوں میں اس قدر جلیلؔ
دیکھا جو آئینہ وہی آیا نظر مجھے

ساقیا صحبتِ دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشم تر صورتِ پیمانہ چھلک جاتی ہے

تیغِ قاتل نے شگوفہ یہ نیا چھوڑا ہے
دل جو روتا ہے تو زخموں کو ہنسی آتی ہے

پوچھتا ہے جو کوئی حال دلِ بسمل کا
آنکھ سے خون کی اک بوند ٹپک جاتی ہے

محفلِ عیش دمِ صبح جو برہم ہو گی
شمع کو فکر ہے ایسی کہ گھُلی جاتی ہے

قتلِ عشّاق کو ہر چند زمانہ گزرا
دستِ قاتل سے ابھی خون کی بو آتی ہے

کیا مصیبت ہے کہ جس دن سے چھٹی مے نوشی
دل جلانے کے لیے روز گھٹا آتی ہے

تیرے بسمل کا کوئی پوچھنے والا نہ رہا
اب تو تلوار بھی منہ دیکھ کے رہ جاتی ہے

بچ کے چلتا ہے لحد سے جو ستمگر اپنا
اڑ کے دامن سے مری خاک لپٹ جاتی ہے

یہ نہ پوچھو خلشِ دل سے تڑپتا ہے جلیلؔ
ناوکِ ناز کی لذّت اسے تڑپاتی ہے

اس کو سمجھائیے کیونکر غمِ فرقت کیا ہے
جس کو یہ بھی نہیں معلوم محبت کیا ہے

ناز و انداز سے چلنا کوئی سیکھے تجھ سے
تیغ کیا چیز ہے خنجر کی حقیقت کیا ہے

موت بھی روٹھ کے بیٹھی ہے مسیحا کی طرح
کس سے پوچھوں کہ علاجِ تپِ فرقت کیا ہے

لاکھ سمجھائیے قابو میں کہاں آتی ہے
کوئی معشوق ہے بے چین طبیعت کیا ہے

ہار شب بھر ترے سینے سے لگا رہتا ہے
رشک آتا ہے کہ پھولوں کی بھی قسمت کیا ہے

ٹھوڑوں دیکھ کے ساقی ترے مے خانے کو
آج مجھ پر یہ کھلا راز کہ جنت کیا ہے

جلوۂ حسن ترا ہوش اڑا دیتا ہے
یہی صورت ہے تو دیدار کی صورت کیا ہے

نگہِ لطف کا مقصد تھا فقط دل اپنا
اب انہیں آنکھ ملانے کی ضرورت کیا ہے

زیب و زینت نہیں درکار حسینوں کو جلیس
چاند سورج کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے

چل اے دِل آج اس کا روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے
بلا سے ہوش اڑ جائیں وہ جلوا ہم بھی دیکھیں گے

یہی اے دردِ دل موقع ہے تڑپانے لُٹانے کا
ز: کہتے ہیں کہ چلمن سے تماشا ہم بھی دیکھیں گے

وہ ملتے تھے حنا ہم دیکھتے تھے شوق سے لیکن
یہ کیا معلوم تھا خونِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے

بتوں کا دیکھنا کیا ہے نظر اپنی یہ کہتی ہے
کہ جو کچھ طور پر موسیٰ نے دیکھا ہم بھی دیکھیں گے

سُنا ہے آج مشتاقوں وہ جلوہ دکھائیں گے
جلیلؔ اپنی نظر اپنا کلیجا ہم بھی دیکھیں گے

تم بھی سرگرم ستم ہو فلک پیر بھی ہے
یہ سمجھ لو کہ مری آہ میں تاثیر بھی ہے

کیا کہوں دل میں محبت کی نشانی کیا ہے
ہجر کا داغ بھی ہے آپ کی تصویر بھی ہے

یہ تو مانا کہ ترے بس میں ہے ساری دنیا
تو مرے بس میں ہو ایسی کوئی تدبیر بھی ہے

بات کرتی نہیں مجھ سے تری تصویر کبھی
تو بھی مغرور ہے ظالم تری تصویر بھی ہے

اک مروت تو نہیں یار کی آنکھوں میں جلیلؔ
ورنہ شوخی بھی ہے جادو بھی ہے تسخیر بھی ہے

نگاہ تاک میں او بے وفا ہے کس کس کی
کہاں گرے گی یہ بجلی قضا ہے کس کس کی

کوئی ہے زخم کا خواہاں کوئی شہادت کا
تمھاری تیغ بھی حاجت روا ہے کس کس کی

ترا خیال بھی ہے غم بھی ہے ملال بھی ہے
ذرا سا دل ہے مگر اس میں جا ہے کس کس کی

وہ آج گھر سے جو نکلے ہیں خوب بن ٹھن کر
ادا یہ کہتی ہے دیکھیں قضا ہے کس کس کی

ملے ہیں درد و غم و یاس خون پینے کو
مرے جگر کا لہو بھی غذا ہے کس کس کی

اسی سے ہاتھ رنگے جاتے ہیں حسینوں کے
ہمارا خونِ تمنا حنا ہے کس کس کی

جو یہ نہ ہو تو نہ پائیں دل و جگر آرام
جلیل دردِ محبت دوا ہے کس کس کی

اِک سنگدل حسین کو دلبر بنائیں گے
ہم بھی جگر کو آج سے پتھر بنائیں گے

ان کی بلا سے رات گزر جائے وصل کی
بیٹھے وہ اپنی زلفِ معنبر بنائیں گے

اہلِ غرض کو منہ نہ لگاؤ بلا کے ہیں
یوسف کہیں گے تم کو پیمبر بنائیں گے

دنیا میں کچھ نشاں دلِ مرحوم کا رہے
چھوٹی سی قبر آپ کے در پر بنائیں گے

چلو سے آج کام نکالیں گے ساقیا
ساغر نہیں تو ہاتھ کو ساغر بنائیں گے

کوثر سے کیا بجھے گی لگی دل کی ساقیا
اک میکدہ بھی ہم لبِ کوثر بنائیں گے

آثار کہہ رہے ہیں یہ طالع کے اے جلیلؔ
میرے حضور مجھ کو سکندر بنائیں گے

مژدۂ دید مجھے دیدۂ تر دیتا ہے
درد اٹھ کر ترے آنے کی خبر دیتا ہے

جام خالی کبھی دیتا ہے جو مجھکو ساقی
خون آنکھوں سے ٹپک کر اسے بھر دیتا ہے

ہے یہ طوفان نیا میرے ڈبونے کے لیے
دیدۂ تر کو مدد دامن تر دیتا ہے

اتنی مہلت نہیں ملتی کہ کوئی بات کروں
وہ نظر ملتے ہی بیخود مجھے کر دیتا ہے

اشک بہتے ہیں جو آنکھوں سے تو بہنے دو جلیلؔ
سینچنا نخلِ محبت کا ثمر دیتا ہے

وہ کہتے ہیں کہ نہیں حاجتِ شراب مجھے
شراب سے ہے سوا نشۂ شباب مجھے

محبت ایک طرف سے مزا نہیں دیتی
کچھ اضطراب تجھے ہو کچھ اضطراب مجھے

ہُوا جواب کا خواہاں جو اُن کو خط لکھ کر
مری اُمید نے پہلے دیا جواب مجھے

میں اپنے منہ سے کروں کیا سوال ساقی سے
زبانِ حال سے ہے گویا کہ دے شراب مجھے

جلیلؔ پیرِ مغاں کی خصوصیت کیا ہے
مُرید ہوں میں اُسی کا جو دے شراب مجھے

تیری چتون کے شہیدوں میں یہ ناشاد بھی ہے
او مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

دلربائی کا ہو سامان مبارک تجھکو
ناز و انداز بھی ہے حسن خداداد بھی ہے

پاس ہے رازِ محبت کا جو خاموش ہوں میں
ورنہ لب پر مرے نالہ بھی ہے فریاد بھی ہے

دل میں درد و غم و اندوہ سبھی ہیں لیکن
قابل ناز تو یہ ہے کہ تری یاد بھی ہے

یہی مارے یہی عاشق کو جلائے بھی جلیلؔ
نگہہِ ناز مسیحا بھی ہے جلاد بھی ہے

تڑپا کے دل مرا نگہِ یار رہ گئی
تھوڑی سی چل کے آج یہ تلوار رہ گئی

کیا حسن تھا کہ آنکھ سے دیکھا ہزار بار
پھر بھی نظر کو حسرتِ دیدار رہ گئی

دشمن نہیں تو اب غمِ دشمن ہے یار کو
کانٹا نکل گیا خلشِ خار رہ گئی

حسن و جمال کا فقط افسانہ رہ گیا
یوسف رہے نہ گرمیِ بازار رہ گئی

قاتل کی چال پر تو گلے کٹ گئے جلیلؔ
ایسا چلا وہ تیز کہ تلوار رہ گئی

دل جا رہا ہے چھوٹ کے زلفِ سیاہ سے
او چشمِ یار باندھ لے تارِ نگاہ سے

پردے کا اہتمام فقط دیکھنے کا ہے
آنکھوں میں پھر رہے ہیں وہ چھپ کر نگاہ سے

افتادگی ہے عشق میں زینہ عروج کا
اچھلا ہے نام حضرتِ یوسف کا چاہ سے

آنکھیں ملا کے مفت میں شرمندگی ہوئی
وہ دل کی بات پا گئے میری نگاہ سے

جب دیکھتے ہے آئینہ آگے دھرا ہوا
وہ دیکھتے ہیں آپ کو میری نگاہ سے

ظلمت میں چار چاند لگائے ہیں نور میں
چہرے کی آب و تاب ہے زلفِ سیاہ سے

آنسو اگر رُکے بھی تو کیا فائدہ ہوا
حسرت ٹپک رہی ہے ہماری نگاہ سے

دیکھو شبِ وصال ہے کیسی رواں دواں
ہو سیر تم جو باندھ لو زلفِ سیاہ سے

آنسو ملے جو خاک میں دل نے کہا جلیلؔ
یارب کوئی گرے نہ کسی کی نگاہ سے

جی میں آیا تھا کروں کچھ میں شکایت تیری
چٹکیاں لینے لگی دل میں محبت تیری

میں سمجھتا تھا کہ آئینہ مجھے دے گا جواب
وہ بھی حیران رہا دیکھ کے صورت تیری

لے کے آیا تھا میں ارمان ہزاروں دل میں
یاد کچھ بھی نہ رہا دیکھ کے صورت تیری

اس قدر محو تصوّر ہوں کہ شک ہوتا ہے
آئینے میں مری صورت ہے کہ صورت تیری

یا خدا لاکھ گنہگار ہو بندہ تیرا
ڈھونڈ لیتی ہے بہانہ کوئی رحمت تیری

یہ کرامت ہے ترے حُسن و ادا کی ظالم
اور بڑھتی ہے ستانے سے محبت تیری

میں سمجھتا ہوں کہ ہے جنت و دوزخ کیا چیز
ایک ہے وصل ترا ایک ہے فرقت تیری

یہ دعا مانگ کے سوتا ہوں میں شب کو ہر روز
جب کھلے آنکھ تو ہو سامنے صورت تیری

کچھ ضرورت نہیں اظہار محبت کی ملیل
خود کہے دیتی ہے بے چین طبیعت تیری

زلفِ لیلیٰ نہیں تو پھر کیا ہے
دل کو سودا نہیں تو پھر کیا ہے

دل میں رہتے ہو آنکھ سے چھپ کر
ہم سے پردہ نہیں تو پھر کیا ہے

لن ترانی نیازمندوں سے
ناز بے جا نہیں تو پھر کیا ہے

تیری زلفِ سیہ کے حلقے میں
دل ہمارا نہیں تو پھر کیا ہے

مرتے مرتے نہ نکلے جو دل سے
وہ تمنا نہیں تو پھر کیا ہے

شمع میں گل میں ماہ و انجم میں
تیرا جلوہ نہیں تو پھر کیا ہے

تو گلستانِ دلربائی کا
گلِ رعنا نہیں تو پھر کیا ہے

لوگ جس کو جلیلؔ کہتے ہیں
تیرا شیدا نہیں تو پھر کیا ہے

حسن کہتا ہے دلربا تو ہے
آنکھ کہتی ہے بے وفا تو ہے

تھک گئے چارہ گر دوا کر کے
یہ نہ سمجھے مری دوا تو ہے

کیا پشیمان ہوں وفا کر کے
میں نہ سمجھا تھا بے وفا تو ہے

ایک سودائی ایک ہرجائی
دربدر میں ہوں جا بجا تو ہے

آئینہ تیری قدر کیا جانے
میری آنکھوں سے پوچھ کیا تو ہے

سب ہیں خواہاں شراب کے تجھ سے
میرا مقصود ساقیا تو ہے

محو ہوں اس قدر تصور میں
شک یہ ہوتا ہے میں ہوں یا تو ہے

آنکھ لڑنے لگی بتوں سے جلیلؔ
ہم تو سنتے تھے پارسا تو ہے

بے پیے کہتے ہیں سب رندِ مے آشام مجھے
بے خودی تو نے کیا مفت میں بدنام مجھے

تم نے اس رنگ کا بیمار نہ دیکھا ہوگا
درد جب تک نہ ہو ملتا نہیں آرام مجھے

ساقیا دل میں جو توبہ کا خیال آتا ہے
دور سے آنکھ دکھاتا ہے ترا جام مجھے

لے چلا دل طرفِ یار خدا خیر کرے
پھر اسی دشمنِ ایماں سے پڑا کام مجھے

میں تو ساقی تری آنکھوں کے مزے لیتا ہوں
عمر بھر کے لیے کافی ہیں یہ دو جام مجھے

کسی بے درد کا در پردہ اشارہ ہوگا
لینے دیتا نہیں دردِ جگر آرام مجھے

دَور چلنے میں نہ ہو دیر خدارا ساقی
اب ستاتی ہے بہت گردشِ ایام مجھے

میں نہ سمجھا تھا کہ مے اتنی گراں قیمت ہے
پارسائی ہوئی صدقے تو ملا جام مجھے

درِ ساقی پہ صدا دیر سے دیتا ہے جلیلؔ
واسطہ ساقیِ کوثر کا کوئی جام مجھے

دل ہے وہی کہ جس میں تری آرزو رہے
گل ہے وہی کہ جس میں محبت کی بو رہے

اشکوں کے دم سے داغِ جگر کی بہار ہے
پانی نہ پائیں پھول تو کیا رنگ و بو رہے

دل میں ہجومِ یاس ہے میرا ہے یہ خیال
اتنی جگہ رہے کہ تری آرزو رہے

لازم نہ تھا یہ آپ کو انصاف کیجئے
ہو دل تو پائمال حنا سرخرو رہے

دیکھوں تجھے تو آپ میں رہنا محال ہو
پاؤں تجھے تو اپنی مجھے جستجو رہے

چشمِ خیال ہے جو سلامت تو غم نہیں
پردوں میں تو رہے تو مرے روبرو رہے

دل کو وہ توڑتے ہیں خوشی کا مقام ہے
کب تک مچل مچل کے مری آرزو رہے

صورت یہ خوب ہے ترے چھپنے کے واسطے
پہلو میں دل رہے دلِ شیدا میں تو رہے

جامِ طہورِ خلد میں پینا ہے اے جلیلؔ
کچھ کچھ ابھی سے عادتِ جام و سبو رہے

آنکھ لڑتے ہی ہوا عشق کا آزار مجھے
چشم بیمار تری کر گئی بیمار مجھے

دل کو زخمی تو وہ کرتے ہیں مگر حیرت ہے
نظر آتی نہیں چلتی ہوئی تلوار مجھے

دیکھئے جان پہ گرتی ہے کہ دل پر بجلی
دور سے تاک رہی ہے نگہ یار مجھے

گرچہ سو بار ان آنکھوں سے تجھے دیکھا ہے
مگر اب تک ہے وہی حسرت دیدار مجھے

مجکو پروا نہیں ناصح تری غمخواری کی
غم سلامت رہے کافی ہے یہ غمخوار مجھے

شیشۂ و جام پہ ساقی کوئی الزام نہیں
تیری آنکھیں کیے دیتی ہیں گنہگار مجھے

یار ساقی ہو تو چلتا ہے ابھی دور جلیل
کون کہتا ہے کہ پینے سے ہے انکار مجھے

کیا ملا تم کو مرے عشق کا چرچا کر کے
تم بھی رسوا ہوئے آخر مجھے رسوا کر کے

مجھ پہ تلوار کا احساں نہ ہوا خوب ہوا
مار ڈالا تری آنکھوں نے اشارا کر کے

نگہِ شوق کو مانع نہیں پردہ کوئی
آپ جائیں گے کہاں آنکھ سے پردا کر کے

تم نے کی وعدہ خلافی تو کوئی بات نہیں
سبھی معشوق مُکر جاتے ہیں وعدا کر کے

ہر مرض کے لیے خالق نے دوا پیدا کی
مجھکو بیمار کیا تجھکو مسیحا کر کے

اڑ گیا رنگ جو مہندی کا تو کیا غم ان کو
پھر جمائیں گے ابھی خونِ تمنا کر کے

شُکر اس بندہ نوازی کا ادا کیا ہو جلیلؔ
میرے سرکار نے رکھا مجھے اپنا کر کے

تیغ قاتل نے عجب رنگ جما رکھا ہے
خون کا نام ستمگر نے حنا رکھا ہے

آئینہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ معشوق ہے تو
تیری تصویر کو سینے سے لگا رکھا ہے

آپ ہنستے ہیں، ہنسیں آپ کو زیبا ہے ہنسی
آپ نے کیوں مرے زخموں کو ہنسا رکھا ہے

کیا قیامت ہے کہ مشتاق بنا کر مجھ کو
اس نے دیدار قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

شاہ کی مدح سے ہے شعر میں تاثیر جلیلؔ
ورنہ ظاہر ہے کہ اشعار میں کیا رکھا ہے

توبہ کرنے سے بدلتی نہیں عادت اپنی
آگئی پھر کسی کافر پہ طبیعت اپنی

مجھکو درکار وہ ساقی ہے جو دریا دل ہو
ایک دو جام سے بھرتی نہیں نیت اپنی

ہر جگہ مجھکو وہ بدنام کیا کرتے ہیں
چاہتے ہیں اسی پردے میں وہ شہرت اپنی

ہم نے کی حسن پرستی تو تجھے کیا ناصح
آنکھ اپنی ہے دل اپنا ہے طبیعت اپنی

ہم نہ کہتے تھے کہ آسان نہیں عشق جلیلؔ
آئینہ لے کے ذرا دیکھیے صورت اپنی

تم جو کہتے ہو کہ دل کی مجھے پروا کیا ہے
اپنی چتون سے تو پوچھو کہ ارادا کیا ہے

یار سے مل کے بھی ٹھہری نہ طبیعت اپنی
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمنا کیا ہے

یہی شوخی ہے تو ٹھہرے گی نہ چہرے پہ نقاب
ایک دو روز کا پردہ ہے یہ پردا کیا ہے

آفریں حضرتِ دل آپ کی دانائی پر
یہ نہ سمجھے تھے محبت کا نتیجا کیا ہے

تیری آنکھوں کے ہیں اے یار کرشمے سارے
سحر کیا چیز ہے اعجازِ مسیحا کیا ہے

تم زباں سے تو کیا کرتے ہو وعدہ لیکن
آنکھ کہتی ہے کہ وعدے کا بھروسا کیا ہے

مست کرنا ہے تو لے کام ادا سے ساقی
ورنہ خالی مئے گلرنگ میں رکھا کیا ہے

اب نظر میں نہیں جچتا کوئی معشوق جلیلؔ
نہیں معلوم مری آنکھ نے دیکھا کیا ہے

تصدق جان سے ہے جس پر وہ اے جانِ جہاں تو ہے
مرے گلزارِ مقصد کی بہارِ جاوداں تو ہے

ترا رنگِ تلوّن بھی نرالی شان رکھتا ہے
ابھی تو آفتِ جاں تھا ابھی آرام جاں تو ہے

ستم پرور ستم گستر ستم پیشہ ستم آرا
کلامِ مختصر یہ ہے زمیں پر آسماں تو ہے

غرورِ حسن گو بیجا ہے لیکن تجھکو زیبا ہے
کہ دلبر ہے حسیں ہے نازنیں ہے نوجواں تو ہے

بھری محفل میں آنسو شمعِ محفل کے نہیں تھمتے
کسی نے کہہ دیا ہے رات بھر کی میہماں تو ہے

شفا ہوتا نہ ہو میرے لیے یہ بات کیا کم ہے
مریضِ درد و غم میں ہوں مسیحائے جہاں تو ہے

ترا ہمسر کوئی طرزِ ستم میں ہو نہیں سکتا
فلک کا نام کیا لوں بیروہ ہے نوجواں تو ہے

جلیل اچھا جما یا رنگ تو نے آ کے گلشن میں
اُدھر ہے نالہ کش بلبل اُدھر گرمِ فغاں تو ہے

ظالم بتوں سے آنکھ لگائی نہ جائے گی
پتھر کی چوٹ دل سے اٹھائی نہ جائے گی

ہونے دو ہو رہے ہیں جو الفت کے تذکرے
بگڑو گے تم تو بات بنائی نہ جائے گی

کہہ دو یہ شمع سے کہ عبث تو ہے اشکبار
پانی سے دل کی آگ بجھائی نہ جائے گی

چلمن ہو یا نقاب ہو یا پردۂ حیا
صورت تری کسی سے چھپائی نہ جائے گی

ممکن ہے تیرِ ناز سے دل کو بچا بھی لوں
لیکن نظر کی چوٹ بچائی نہ جائے گی

آنکھیں خدا نے دی ہیں تو دیکھیں گے حسنِ یار
کب تک نقاب رُخ سے اٹھائی نہ جائے گی

توبہ کو منہ لگا کے خجل ہو گئے تم جلیلؔ
جام و سبو سے آنکھ مِلائی نہ جائے گی

ابھی سے آفتِ جاں ہے ادا ادا تیری
یہ ابتدا ہے تو کیا ہوگی انتہا تیری

مری سمجھ میں یہ قاتل نہ آج تک آیا
کہ قتل کرتی ہے تلوار یا ادا تیری

نقاب لاکھ چھپائے وہ چھپ نہیں سکتی
مری نظر میں جو صورت ہے دلربا تیری

لہو کی بوند بھی اے تیرِ یار دل میں نہیں
یہ فکر ہے کہ تواضع کروں میں کیا تیری

سُنگھا رہی ہے مجھے غش میں نکہتِ گیسو
خدا دراز کرے عمر اے صبا تیری

ادا یہ ناز تو ہوتا ہے سب حسینوں کو
قضا کو ناز ہے جس پر وہ ہے ادا تیری

جلیلؔ یار کے در تک گزر نہیں نہ سہی
ہزار شکر کہ ہے اس کے دل میں جا تیری

حسن میں آفتِ جہاں تو ہے
چال میں خنجرِ رواں تو ہے

دونوں ظالم ہیں فرق اتنا ہے
آسماں پیر ہے جواں تو ہے

بے کہے دل کا حال روشن ہے
اے خموشی مری زباں تو ہے

اپنے گھر میں خیال میں دل میں
ایک ہو کر کہاں کہاں تو ہے

دونوں جانب سے پردہ داری ہے
میں ہوں گمنام بے نشاں تو ہے

سب سے پیاری ہے جان دنیا میں
جان سے بڑھ کے جانِ جاں تو ہے

آئینے پر نہیں یہ چشمِ کرم
اپنی صورت کا قدرداں تو ہے

کیا برابر کا جوڑ ہے یہ جلیل
یار نازک ہے ناتواں تو ہے

میں اپنے ہوش میں اے فتنہ گر نہیں نہ سہی
تری خبر تو ہے اپنی خبر نہیں نہ سہی

یہاں تو پیکِ تصور سے کام چلتا ہے
صبا نہیں نہ سہی، نامہ بر نہیں نہ سہی

شریکِ حال تمھارا خیال رہتا ہے
تمھیں خیال ہمارا اگر نہیں نہ سہی

ہمارے دل پہ نظر ہے یہی غنیمت ہے
ہمارے حال پہ تجھ کو نظر نہیں نہ سہی

جلیل جذبِ محبت سے کام نکلے گا
ہمارے نالۂ دل میں اثر نہیں نہ سہی

دیکھا جو حسنِ یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور دل پہ چل گئی

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ساقی تری شراب جو شیشے میں تھی پری
ساغر میں آکے اور بھی سانچے میں ڈھل گئی

دشمن سے پھر گئی نگہِ یار شکر ہے
اک پھانس تھی کہ دل سے ہمارے نکل گئی

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیلؔ
بادل کا رنگ دیکھ کے نیّت بدل گئی

اشکوں نے گر کے خاک پہ مٹی خراب کی
کیا کیا ہنسی اڑی مری چشمِ پر آب کی

نالے کا ساتھ اشک نہ دیتے تو خوب تھا
دونوں نے مل کے اور بھی مٹی خراب کی

واعظ مئے طہور جو پینا ہے خلد میں
عادت ابھی سے ڈال رہا ہوں شراب کی

رندوں کے ہاتھ سے نہیں ٹوٹی یہ ساقیا
نشہ میں چور ہو گئی بوتل شراب کی

یوں کہہ کے بے حجاب کیا ہم نے اے جلیلؔ
کچھ آفتاب کو نہیں حاجت نقاب کی

ڈوبنا بحرِ مصیبت میں گوارا کرتے
وہ نہ تھے ہم کہ محبت سے کنارا کرتے

کاش آئینہ کی تقدیر میسّر ہوتی
وہ ہمیں دیکھتے ہم ان کا نظارا کرتے

چاند سی شکل جو اللہ نے دی تھی تم کو
کاش روشن مری قسمت کا ستارا کرتے

دیکھ لیتے جو مرے دل کی پریشانی کو
آپ بیٹھے ہوئے زلفیں نہ سنوارا کرتے

دل میں ہوتا جو اثر جذبِ محبت کا خلیلؔ
ہم اسی شیشے میں پریوں کو اتارا کرتے

رات بھر وہ شمعِ محفل بن کے محفل میں رہے
دن ہوا دشمن تو چھپ کر گوشۂ دل میں رہے

تیر پہلو میں رہے یا دستِ قاتل میں رہے
ہے غرض اتنی کہ تھوڑی سی کھٹک دل میں رہے

دل تو ٹکڑے کر چکے اب یہ بتاتے جائیے
آرزو جائے کہاں ارمان کس دل میں رہے

میکدے کا راز مستی میں چھپانا فرض ہے
ظرف جو رکھتا ہے وہ ساقی کی محفل میں رہے

لطف دونا ہو جو دونوں گھر مرے آباد ہوں
تو رہے پہلو میں تیری آرزو دل میں رہے

ہوش کیا جاتے جنوں میں چھوڑ کر تنہا مجھے
وہ بھی کچھ اُلجھے ہوئے طوق و سلاسل میں رہے

پردہ داری لاکھ کی پردہ دری ہو کر رہی
آنکھ سے ٹپکے وہی ارمان جو دل میں رہے

جانے والے کب کے پہنچے منزلِ مقصود پر
ایک ہم اب تک تلاشِ خضرِ منزل میں رہے

وہ تو راہی ہو گئے صورت دکھا کر اے جلیلؔ
مفت کے جھگڑے ہمارے دیدہ و دل میں رہے

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے
کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

غرور سے جو زمیں پر قدم نہیں رکھتی
یہ کس گلی سے نسیمِ بہار آتی ہے

رفو نہ کرا سے اے بخیہ گر خدا کے لیے
کہ چاکِ دل سے ہوا خوشگوار آتی ہے

وہ گھر سے آج جو نکلے ہیں سیرِ گل کے لیے
چمن میں دھوم ہے فصلِ بہار آتی ہے

اس آئینے کی سکندر تلاش ہے مجھ کو
جس آئینے میں نظر شکلِ یار آتی ہے

قدم قدم پہ چمن عیش کا کِھلاتے ہوئے
وہ آتے ہیں کہ نسیمِ بہار آتی ہے

کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر
یہ جس پہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

چُھٹا ہے جب سے جلیلؔ آشیاں یہ سنتا ہوں
کہ روز باغ میں فصلِ بہار آتی ہے

شبِ وعدہ عذرِ حنا ہو رہا ہے
وہاں آج خونِ وفا ہو رہا ہے

ترے حسن کا ذکر مذکور میرا
یہی آجکل جا بجا ہو رہا ہے

یہاں اُڑ گئی خاک اہلِ وفا کی
وہاں امتحانِ وفا ہو رہا ہے

وہ لیتے رہے جاں نثاروں کی جانیں
کسی نے نہ پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے

تماشا تو دیکھو کہ تڑپا کے مجھ کو
وہ بے چین مجھ سے سوا ہو رہا ہے

ستم ہے ستم کعبۂ دل کا ڈھانا
یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے

اُڑھاتی ہے وہ تیغ چادر لہو کی
شہیدوں کو خلعت عطا ہو رہا ہے

منائے گی کس کس کو اِک جان میری
اُدھر تم اِدھر دَم خفا ہو رہا ہے

جلیلؔ آج کل کشورِ دل میں اپنے
غمِ عشق فرماں روا ہو رہا ہے

مجھے جس دم خیال نرگسِ مستانہ آتا ہے
بڑی مشکل سے قابو میں دلِ دیوانہ آتا ہے

مزا دیتا ہے جب بادل بسوئے میخانہ آتا ہے
صراحی جھومتی ہے وجد میں پیمانہ آتا ہے

مچلنا روٹھنا بے چین دل کا اِک تماشہ ہے
یہ وہ عاشق ہے جس کو نازِ معشوقانہ آتا ہے

مرے جانے پہ اُٹھ جاتی ہے فوراً آنکھ ساقی کی
وہ میکش ہوں کہ استقبال کو میخانہ آتا ہے

کوئی ساغر بکف ہے کوئی محوِ چشمِ ساقی ہے
ہمارے ہاتھ دیکھیں کون سا پیمانہ آتا ہے

مری توبہ ہے ایسی جس کو خود توبہ کی حاجت ہے
بدل جاتی ہے نیت یاد جب میخانہ آتا ہے

تجھے تو شوقِ مے نوشی ہے مجھ کو رشک اس کا ہے
ترا لب چومنے کو دم بدم پیمانہ آتا ہے

مشیت جب یہی ٹھہری تو میری کیا خطا ناصح
حرم کو ڈھونڈتا ہوں سامنے بُت خانہ آتا ہے

جلیلؔ اس سے پتہ چلتا ہے دل کی بیقراری کا
کہ لب پر شعر جو آتا ہے بیتابانہ آتا ہے

ہر اک محفل میں ذکرِ نرگسِ مستانہ ہوتا ہے
یہی مے اب تو چلتی ہے یہی پیمانہ ہوتا ہے

شریکِ بزمِ جاناں کب کوئی بیگانہ ہوتا ہے
جو ہوتا ہے وہ شمعِ حسن کا پروانہ ہوتا ہے

ہمارا کام چلتا ہے فقط مے کے تصور سے
یہی ساقی یہی شیشہ یہی پیمانہ ہوتا ہے

جفا ہو یا لگاوٹ ہو وفا ہو یا رکاوٹ ہو
طرحداروں کا ہر انداز معشوقانہ ہوتا ہے

غرض کے آشنا ہیں ساقیا سب بزمِ عالم میں
جہاں شیشہ ہوا خالی جدا پیمانہ ہوتا ہے

نہیں ممکن کہ ہر انسان میں سوزِ محبت ہو
ہزاروں میں کہیں اِک دلجلا پروانہ ہوتا ہے

سمجھ والے سمجھ سکتے نہیں راز محبت کو
وہی کچھ باخبر ہوتا ہے جو دیوانہ ہوتا ہے

ذرا میں ہوش میں آؤں تو پوچھوں اپنے ساقی سے
نظر توبہ شکن ہوتی ہے یا پیمانہ ہوتا ہے

جلیلؔ اچھا ہے دل کو صاف رکھنا ہر کدورت سے
اسی گھر میں ظہورِ جلوۂ جانانہ ہوتا ہے

علاج کی نہیں حاجت دل و جگر کے لیے
بس اِک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لیے

فراق میں نہ ہوا بے کسی کا غم مجھ کو
جو تم گئے تو غش آیا کیا خبر کے لیے

خدا نے تجھ کو بنایا ہے ناز نیں قاتل
ادا کی تیغ ہے موزوں تری کمر کے لیے

وہ پھر بھی حسن پہ اپنے غرور کرتے ہیں
یہ جانتے ہیں کہ ہر شام ہے سحر کے لیے

وہ پونچھتے ہیں مرے اشک اپنے دامن سے
یہ آبرو ہے زمانے میں کس گہر کے لیے

میں اپنی جان کو مٹھی میں لے کے آیا ہوں
یہ نذر ہے تری جادو بھری نظر کے لیے

شب وصال گئی دے کے داغ فرقت کا
نیا یہ پھول کھلا دامنِ سحر کے لیے

دکھائیے رخ روشن تو مشکل آساں ہو
ترس رہی ہے شب غم مری سحر کے لیے

جلیل دیدۂ خونبار سے خدا سمجھے
لہو کی بوند نہ چھوڑی دل و جگر کے لیے

دل جلے عشق کے ڈرتے نہیں جل جانے سے
لذّت سوزِ جگر پوچھئے پروانے سے

چشمِ ساقی کا اشارہ ہے یہ پیمانے سے
دیکھ ہشیار نہ جائے کوئی میخانے سے

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بت خانے سے

رس بھری آنکھ جو دیکھی ہے تری اے ساقی
میری نیت نہیں بھرتی کسی پیمانے سے

اب تو پینے کی بھی حاجت نہ رہی اے ساقی
ہوش اڑ جاتے ہیں خالی ترے پیمانے سے

بے خبر ہو کے زمانے کی خبر رکھتا ہے
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے

خوب مستی میں گزرتی تھی مگر وائے نصیب
ہوش نے آ کے نکالا مجھے میخانے سے

ہوں وہ میکش کہ نظر بھر کے جہاں دیکھ لیا
مئے گلرنگ چھلک جاتی ہے پیمانے سے

پارسائی کا بہت کرتے تھے اظہار جلیلؔ
جھومتے آج چلے آتے ہیں میخانے سے

ساقیا کیوں نہ ہوس ہو مجھے میخانے کی
دل ہے شیشے کا مری آنکھ ہے پیمانے کی

اشک خوں پر ہو نہ کیوں ناز مری آنکھوں کو
آبرو ہے مئے گلرنگ سے پیمانے کی

ساری محفل کو لٹا کر یہ کہا ساقی نے
اک ادا تھی مرے چلتے ہوئے پیمانے کی

شمع پر خون کا الزام ہو ثابت کیونکر
پھونک دی لاش بھی کمبخت نے پروانے کی

آنکھوں آنکھوں میں پلا دی مرے ساقی نے مجھے
اب نہ شیشے کی ضرورت ہے نہ پیمانے کی

آپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں
دلِ بے تاب کو عادت ہے مچل جانے کی

مست کر دیتی ہے پہلے ہی نگاہِ ساقی
آنکھ کے سامنے چلتی نہیں پیمانے کی

میں نے پوچھا تھا کہ ہے منزلِ مقصود کہاں
خضر نے راہ بتائی مجھے میخانے کی

بیخودی میں بھی یہی منہ سے نکلتا ہے جلیلؔ
شیشے آباد رہیں خیر ہو پیمانے کی

وصالِ یار بھی ہے دَور میں شراب بھی ہے
قمر بھی ہے مرے پہلو میں آفتاب بھی ہے

یہ حسن کی نہیں جادوگری تو پھر کیا ہے
کہ تیری آنکھ میں شوخی بھی ہے حجاب بھی ہے

کسی کو تاب کہاں ہے کہ تجھ کو دیکھ سکے
جو نور ہے ترے رُخ پر وہی نقاب بھی ہے

ثبوتِ عشق کو یہ دو گواہ کافی ہیں
جگر میں داغ بھی ہے دل میں اضطراب بھی ہے

غرورِ حُسن تجھے جس قدر ہو زیبا ہے
خُدا کے فضل سے صورت بھی ہے شباب بھی ہے

ستم کی چال ستم کی ادا ستم کی نگاہ
ترے ستم کا ستمگر کوئی حساب بھی ہے

مرے لیے نہیں پینے کی کچھ کمی ساقی
کہ چشمِ مست بھی ہے ساغر شراب بھی ہے

جلیل نے تمھیں چاہا تو کیا گناہ کیا
تمھیں بتاؤ تمھارا کوئی جواب بھی ہے

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

یاد ہیں وہ دن کہ تم کو دلبری آئی نہ تھی
آنکھ میں جادو نہ تھا لب میں مسیحائی نہ تھی

ایک دن دیکھی تھی اس نے وحشتِ مجنوں کی سیر
پھر تو لیلیٰ خود تماشا تھی تماشائی نہ تھی

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہر قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

بیقراری کیوں نہ ہو تازہ شکارِ عشق کو
چوٹ وہ کھائی ہے دل پر جو کبھی کھائی نہ تھی

میری بدنامی سے تم کو خوش نہ ہونا چاہیے
قیس رسوا تھا تو کیا لیلیٰ کی رسوائی نہ تھی

درد و غم کے ساتھ کاٹیں ہم نے راتیں ہجر کی
تھی مزے کی اپنی تنہائی کہ تنہائی نہ تھی

لطف سے گزری ہماری خانۂ صیاد میں
ہم قفس تھے اور کچھ بھی قیدِ تنہائی نہ تھی

آئینہ بھی سامنے ان کے تھا ہم بھی تھے جلیلؔ
سب کو سکتہ تھا کسی میں تابِ گویائی نہ تھی

ے چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے
نگہتِ شوق پردہ در بھی ہے

کس کو سمجھوں میں راز دار اپنا
دل بھی دشمن ہے چشمِ تر بھی ہے

محوِ نظارہ آئینہ کب تک
بندہ پرور مری نظر بھی ہے

دل عجب شے ہے راہِ الفت میں
راہزن بھی ہے راہبر بھی ہے

تم جو آنکھیں مجھے دکھلتے ہو
کچھ برے حال پر نظر بھی ہے

شمع کے ساتھ میں جلوں کب تک
اے شبِ غم تری سحر بھی ہے

کون توبہ شکن نہیں ساقی
مے تو مے ہے تری نظر بھی ہے

اس غزل کا جلیل کیا کہنا
مختصر بھی ہے پُر اثر بھی ہے

چلتے پھرتے جہاں نظر آئے
آنکھ سے دل میں وہ اتر آئے

اُس کی آنکھوں پہ میں فدا سو بار
جس کو اِک بار تو نظر آئے

وہ بھی آنے کو ہیں قیامت بھی
دیکھئے کون پیشتر آئے

اُس کو محوِ خیال کہتے ہیں
کی نظر جس پہ تم نظر آئے

خیر ہو دل کی آج دامن میں
چند ٹکڑے مجھے نظر آئے

کر گئے بے خبر دو عالم سے
خوب لینے مری خبر آئے

تجھ پہ آیا شباب میں سمجھا
نخلِ اُمید میں ثمر آئے

دی دعا جام دے کے ساقی نے
ہوش میں تو نہ عمر بھر آئے

دل کے داغوں کا ہے وہ رنگ جلیلؔ
باغ جیسے بہار پر آئے

ملتی نہیں کچھ اہلِ چمن کی خبر مجھے
لے چل اُڑا کے تو ہی نسیمِ سحر مجھے

کس لطف کی نظر تھی لیا جس نے دل مرا
اب ڈھونڈتا ہوں ملتی نہیں وہ نظر مجھے

کب تک جلا کرے کوئی سوزِ فراق سے
اے کاش پھونک دے تری برقِ نظر مجھے

ناداں ہیں پوچھتے ہیں جو مجھ سے خبر تری
تیری خبر ہو کیا نہیں اپنی خبر مجھے

محوِ خیالِ یار ہوں میں اس قدر جلیلؔ
دیکھا جو آئینہ وہی آیا نظر مجھے

پوچھتے ہیں یہ مری قبر پہ آنے والے
کیسی گزری عدم آباد کے جانے والے

آفریں شوخیِ رفتار پہ او مستِ خرام
فتنۂ حشر سرِ راہ اٹھانے ولے

میرے ہوتے نہ کہیں غیر نشانہ ہو جائے
اک ذرا دیکھ کے او تیر لگانے والے

ہم بھی ہیں چاہنے والوں میں ترے یاد رہے
دولتِ حسنِ خداداد لٹانے والے

اے جلیلؔ اب سرِ منزل ہے پہنچنا معلوم
راہزن ہو گئے خود راہ بتانے والے

دل میں خدنگِ ناز جو مہمان ہو گئے
اتنا کیا قیام کہ ارمان ہو گئے

وصل و فراق پر ہے مدارِ حیات و مرگ
معشوق کیا ہوئے وہ مری جان ہو گئے

آئے وہ اس ادا سے نسیمِ سحر کے ساتھ
جتنے چراغِ بزم تھے قربان ہو گئے

ساغر ہیں آبدیدہ تو شیشے شکستہ دل
ہم توبہ کر کے آج پشیمان ہو گئے

دیدار کو گئے تھے ہم اس جلوہ گاہ میں
صورت وہ پیش آئی کہ حیران ہو گئے

نازک گلوں پہ رنگِ مسرت بھی بار ہے
آئی ہنسی کہ چاک گریبان ہو گئے

مشکل ہے لا سکے کوئی تابِ جمالِ یار
گیسو بھی رُخ پہ آ کے پریشان ہو گئے

تھا شب کو جو سرور ان آنکھوں میں اب کہاں
آباد ہو کے میکدے ویران ہو گئے

ان کے نگاہ لطف کی بس دیر تھی جلیلؔ
مشکل جو مرحلے تھے سب آسان ہو گئے

صبا نے مجھ کو سنگھائی ہے جب سے بو تیری
چمن چمن لیے پھرتی ہے جستجو تیری

اب اور تیر لگانے کی کیا ضرورت ہے
کھٹک رہی ہے کلیجے میں آرزو تیری

یہ چار چاند مرے عشق نے لگائے ہیں
کہ آج حسن میں شہرت ہے چار سو تیری

مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو
بہت ہے میرے لیے ایک آرزو تیری

ہوا ہے مشقِ تصوّر سے اس قدر حاصل
کہ تو کہیں بھی ہو صورت ہے روبرو تیری

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے
کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

مجھے تو رشک ترے آئینے پہ آتا ہے
کہ صبح ہوتے ہی صورت ہے روبرو تیری

جلیلؔ اشک فشانی نہ کر بقول امیرؔ
ملے نہ خاک میں موتی سی آبرو تیری

غیر کیا ناز اٹھائیں گے بہت مشکل ہے
یہ ہمارا ہے کلیجہ یہ ہمارا دل ہے

جو کچھ ارشاد ہے ناصح کا بجا ہے لیکن
میں حسینوں کو نہ چاہوں یہ بڑی مشکل ہے

صبر کی تاب نہیں جس کو وہ دل ہے میرا
رحم کا نام نہیں جس میں وہ تیرا دل ہے

یار بھی رنگ بدلتا ہے زمانے کی طرح
وہی دم بھر میں مسیحا ہے وہی قاتل ہے

تشنہ کامی کی شکایت مجھے کیوں ہو کہ جلیلؔ
مہرباں مجھ پہ مرا ساقی دریا دل ہے

روحِ سخن

(دیوانِ سوم)

۱۹۱۶ء—۱۹۴۵ء

جلیلؔ آنکھوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں بھر بھر کر
وہ اگلی صحبتِ پیرِ مغاں جب یاد آتی ہے

دکانِ مے پہ پہنچ کے کھلی حقیقتِ حال
حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

چشمِ میگوں پہ ہیں زلفوں کی ادائیں کیا کیا
جھومتی ہیں سرِ میخانہ گھٹائیں کیا کیا

دم میں غم دم میں خوشی دم میں خزاں دم میں بہار
گلشنِ دہر میں چلتی ہیں ہوائیں کیا کیا

شعلۂ حسنِ رخِ یار کے بھڑکانے کو
کوچۂ زلف سے آتی ہیں صدائیں کیا کیا

تم سے ملنے پہ یہ اے جان سمجھ میں آیا
دلربائی کی بھی ہوتی ہیں ادائیں کیا کیا

شوقِ بیداد مرے حق میں مبارک نکلا
کرتے ہیں وہ مرے جینے کی دعائیں کیا کیا

دل ہزاروں کے ہیں وابستہ تری زلفوں سے
ان بلاؤں سے بھی لپٹی ہیں بلائیں کیا کیا

صبر آئے کہ وہ آئیں کہ قیامت آئے
مانگتا ہوں میں شبِ ہجر دعائیں کیا کیا

ہر ادا کہتی ہے ان کی کہ قضا کو میں نے
جان لینے کی سکھائی ہیں ادائیں کیا کیا

میکدہ چھوڑ کے بھی چین نہیں ہم کو جلیل
آتی ہیں قلقلِ مینا کی صدائیں کیا کیا

بلبل کا غم چمن میں ستم ڈھا کے رہ گیا
جو گل کھلا وہ آہ سے مرجھا کے رہ گیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسیں
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

چلتے ہوئے چمن میں وہ بادِ صبا کے ساتھ
میں ساتھ ان کے نقشِ کفِ پا کے رہ گیا

لایا گلِ مراد نہ جھونکا نسیم کا
دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

تعریف حشر اس نے جو پوچھی تو اے جلیلؔ
قصۂ شبِ فراق کا دہرا کے رہ گیا

مزہ ہو تو جو چلے کاٹ کر گلو میرا
اچھل کے تھام لے دامن ترا لہو میرا

وہ بادہ کش ہوں کہ ساقی وصال ہونے پر
کریں گے دھوم سے ماتم خم و سبو میرا

میں لڑکھڑا کے سرِ بزم مے گرا ہوتا
جو ہاتھ تھام نہ لیتے خم و سبو میرا

چمن کی سیر کو کہئے تو عذر کرتے ہیں
کہ گل ہیں چور اڑا لیں گے رنگ و بو میرا

صبا یہ رندوں سے کہنا کہ چھوڑ کر مجھکو
لگائے منھ سے جو ساغر پئے لہو میرا

چلا تھا نشہ میں سوئے حرم خجالت سے
عرق عرق جو ہوا ہو گیا وضو میرا

ہر ایک پھول نزاکت میں خستہ حالی میں
تری شبیہ ہے نقشہ ہے ہو بہو میرا

فلک سے خون کسی بے گنہ کا کیا چھپتا
شفق کے رنگ میں ظاہر ہوا لہو میرا

نسیم لطفِ الٰہی کے میں نثار جلیلؔ
کہ پھول پھل کے رہا نخلِ آرزو میرا

کیوں نہ میرے ہر سخن میں رنگ ہو تسخیر کا
دیکھنے والا ہوں کس کے حسنِ عالمگیر کا

چرخ کو مدِ نظر ہے کھینچنا پوری شبیہ
ماہِ نو تو صرف خاکہ ہے تری تصویر کا

فصلِ گُل کا باغ سے جانا قیامت تھا مگر
ہو کے رخصت بار ہلکا کر گئی زنجیر کا

حیرت افزا ہے شبیہ اس کی کہ مثلِ شمعِ بزم
جس طرف سے دیکھئے رُخ ہے وہی تصویر کا

ان کے نامے سے ہو کیا تسکیں دلِ بیتاب کو
خط تو بھیجا رکھ لیا مطلب مگر تحریر کا

حسنِ صورت سے غرض ہے مجکو کیا سیرت سے کام
دیکھتا ہوں ایک ہی رخ میں تری تصویر کا

شاخِ گل جیسے لچکتی ہو ہوا سے بار بار
رنگ وہ ہے خون میں ڈوبی ہوئی شمشیر کا

چاند کو دیکھا سرِ گردوں تو عقدہ کھُل گیا
کیوں مرقع سے ورق گم تھا تری تصویر کا

حشر میں کھینچے لیے جاتا ہے دنیا کو جلیلؔ
شوقِ نظارہ کسی کے رُوئے پُر تنویر کا

مزہ وحشت میں کیا آتا مجھے سیرِ گلستاں کا
رگِ گل کو میں سمجھا تار ہے یہ بھی گریباں کا

یہی ہے شمع اپنی اور یہی عالم چراغاں کا
جو شام آئی تو لے بیٹھے تصور روئے جاناں کا

زمانہ دیکھتا ہے سوئے گردوں اک تماشا ہے
ہلالِ عید کیا ہے چاک ہے میرے گریباں کا

ہم آ کر سوئے صحرا پڑ گئے آفت میں کانٹوں سے
ہر اک کہتا ہے مجکو بھی کوئی پرزہ گریباں کا

چراغِ عقل جس نے کر دئے گل ہوشیاروں کے
وہ اک ہلکا سا جھونکا تھا ہوائے کوئے جاناں کا

تری بکھری ہوئی زلفوں کا عالم ہے وہی اب تک
مرقع بن گئیں آخر مرے حالِ پریشاں کا

ذرا صورت تو دیکھو آئینہ کی کیسا حیراں ہے
بہت آسان سمجھا تھا نظارہ روئے جاناں کا

نسیمِ صبح بکھراتی ہوئی زلف اس کے شانوں پر
چلی ہے کھول کر دفتر مرے حالِ پریشاں کا

جلیلؔ اب شمع تربت ہی نہ باقی ہے نہ گل باقی
اداسی دیتی ہے کچھ کچھ پتا شامِ غریباں کا

خم ہوا شیشہ ہوا مے ہوئی پیمانہ ہوا
کون تھا جس سے نہ ساقی مرا یارانہ ہوا

کشتۂ شمع ادھر بزم میں پروانہ ہوا
میں ادھر سوختۂ جلوۂ جانانہ ہوا

سب شرر تھے یہ مرے داغ جگر کے سر بزم
شمع بن کر کوئی چمکا کوئی پروانہ ہوا

قدر بے مایہ نہیں میکدۂ عالم میں
ہم بغل شیشۂ خالی سے نہ پیمانہ ہوا

شمع کا بزم میں جلنا تھا کہ اڑ کر آیا
آتش حسن کا شعلہ پر پروانہ ہوا

دل شکن ہونے لگیں اب تری باتیں واعظ
دل نہ ٹھہرا کوئی شیشہ ہوا پیمانہ ہوا

دوست سے دوست کی ایذا نہیں دیکھی جاتی
شمع کو آگ لگی سوختہ پروانہ ہوا

منحصر موسم گل پر نہیں سودا میرا
آ گیا ذکر ترا اور میں دیوانہ ہوا

صحبت اہل جہاں سے ہے بہت تنگ جلیلؔ
آج وہ معتکف گوشۂ میخانہ ہوا

آنکھوں نے مری حشر کا ساماں نہیں دیکھا
جب تک تجھے اے جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

آشفتگیٔ خاطرِ ناشاد نہ پوچھو
کیا تم نے کبھی خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

جس دن سے گرفتار ہوئی بلبلِ شیدا
اس دن سے کسی پھول کو خنداں نہیں دیکھا

گردش تو زمانے کی بہت دیکھی ہے لیکن
کروٹ تجھے لیتے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

نظروں میں جو تھے پھول سے رخسار کسی کے
کچھ ہم نے دمِ سیرِ گلستاں نہیں دیکھا

زلفوں کی درازی پہ کرو ناز نہ اتنا
تم نے ابھی طولِ شبِ ہجراں نہیں دیکھا

گلزارِ جہاں میں دلِ پُر داغ ہمارا
وہ گل ہے کسی نے جسے خنداں نہیں دیکھا

اب تک ہیں اسی شک میں ترے دیکھنے والے
دیکھا بھی ہے یا جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

وہ دردِ جلیل آپ کو قسمت سے ملا ہے
جس کو کبھی منت کشِ درماں نہیں دیکھا

ذکرِ گل چھیڑ کے خونِ دلِ ناشاد کیا
کام جلاد کا تو نے مرے صیاد کیا

یاد کرنے کا طریقہ کوئی سیکھے ہم سے
آپ کو بھول گئے اتنا اسے یاد کیا

محو صیاد کچھ ایسا تھا خبر تک نہ ہوئی
کب کیا قید مجھے کب مجھے آزاد کیا

اب ستم کو بھی ترستے ہیں ستم کش تیرے
یہ ستم تو نے نیا اے ستم ایجاد کیا

تھی نہ صیاد کو منظور جدائی میری
جب نہ طاقت رہی اُڑنے کی تو آزاد کیا

گل کا تھا پاس نزاکت کہ چمن میں ہم نے
آہ کھینچی نہ کبھی وا لب فریاد کیا

کوئی ایثار یہ دیکھے ترے دیوانوں کا
آپ برباد ہوئے دشت کو آباد کیا

تو صبا خوش رہے غنچوں کو کھلانے والی
قید میں نکہتِ گل تھی اُسے آزاد کیا

میکدے سے جو نکالا مری توبہ نے جلیل
مدتوں شیشہ و ساغر نے مجھے یاد کیا

خوشی نہ تھی مئے و مستی نہ تھی کہ جوش نہ تھا
سبھی تھے محفل ساقی میں ایک ہوش نہ تھا

اس اتفاق کو فضل خدا سمجھ واعظ
کہ جو مے ترے لب پر تھی مجھکو ہوش نہ تھا

تمام عمر سبکسار عشق نے رکھا
کہ سر دھرا تھا ہتھیلی پہ بار دوش نہ تھا

دکان مے پہ پہنچ کر کھلی حقیقت حال
حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

بڑے مزے سے اسیروں نے کی بسر صیاد
چمن کی یاد تھی دام و قفس کا ہوش نہ تھا

گئے جو ہم سر بازار عشق یہ دیکھا
کہ خود فروش تھے سب کوئی سرفروش نہ تھا

قدم قدم پہ ہیں ذی ہوش کے لیے پھندے
وہی جہاں میں تھا آزاد جس کو ہوش نہ تھا

بڑا ہی کام کیا پردۂ ندامت نے
وگرنہ کوئی گناہوں کا پردہ پوش نہ تھا

کیا جلیل کو یاروں نے مفت میں بدنام
وہ اپنے حال میں تھا مست بادہ نوش نہ تھا

ہوا اچھا مرے حق میں جنوں کا جوش ہو جانا
وہ کہتے ہیں کہ اب بیکار ہے روپوش ہو جانا

گھٹاؤں کا بھی ہے جھومنا سر پر تو اے ساقی
بہت ممکن ہے میرا بے پیئے مدہوش ہو جانا

بھلا دیتا ہے ساری کلفتیں شبہائے ہجراں کی
تصور میں کسی کا زینتِ آغوش ہو جانا

دمِ نظارہ آ جائے حیا اے جاں تو آنے دو
مرے پلکوں کی چلمن ڈال کر روپوش ہو جانا

وہ زانو پر دھرے ہیں سر مرا قسمت یہ کہتی ہے
مبارک ہو جمالِ یار سے بے ہوش ہو جانا

فقط شب بھر کی رونق ہے یہ ساری بزمِ ہستی کی
پکارے کہہ رہا ہے شمع کا خاموش ہو جانا

عجب استاد ہے مستی بھری تیری جوانی بھی
سکھایا جس نے تجھ کو بے پیئے مدہوش ہو جانا

رہے محفوظ رازِ بزمِ خلوت مدعا یہ ہے
نہیں حکمت سے خالی شمع کا خاموش ہو جانا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے در پردہ محبت کا
جلیل ان کا تمھارے نام پر خاموش ہو جانا

تیری چتون سے ہے فسوں گر مجھے معلوم نہ تھا
یہی بن جاتی ہے خنجر مجھے معلوم نہ تھا

دنگ ہوں دیکھ کے مستوں کے سکون دل کو
اثرِ گردشِ ساغر مجھے معلوم نہ تھا

اب تو زاہد بھی یہ کہتا ہے بڑی چوک ہوئی
جام میں تھی مئے کوثر مجھے معلوم نہ تھا

کہہ گیا اپنی زباں سے میں جنوں میں کیا کیا
دل میں بیٹھا تھا وہ چھپ کر مجھے معلوم نہ تھا

نازنیں ہو کے وہ بیدرد ہے قدرت اس کی
پھول ہو جائے گا پتھر مجھے معلوم نہ تھا

کہہ گئے آج وہ شرمائی ہوئی آنکھوں سے
حسن کی دھوم تھی گھر گھر مجھے معلوم نہ تھا

میں قیامت کو سمجھتا تھا بڑا فتنہ ہے
تو قیامت سے ہے بڑھ کر مجھے معلوم نہ تھا

دل لگی کے لیے دل اس سے لگایا تھا جلیلؔ
جان ہو جائے گی دوبھر مجھے معلوم نہ تھا

رہ گیا پردہ اگر میری سیہ کاری کا
نام ہو جائے گا یارب تری ستاری کا

میں ہوں قائل تری آنکھوں کی فسوں کاری کا
مست ہو کر یہ سبق دیتی ہے ہشیاری کا

اس سے کیا بڑھ کے تمنائے شہادت ہوگی
آپ دیتا ہوں ثبوت اپنی گنہگاری کا

کیا کوئی جام ہے ایسا بھی کہ پی کر جس کو
ساقیا ہوش نہ باقی رہے میخواری کا

سنتے ہیں باغ میں جس روز بہار آئی ہے
ہائے دن تھا وہی بلبل کی گرفتاری کا

بے پئے چین نہیں ہوش نہیں جان نہیں
شوق کا ہے کو مرض ہے مجھے میخواری کا

قیدِ صیاد میں بلبل کا چہکنا نہ گیا
اب بھی سمجھی نہ سبب اپنی گرفتاری کا

کسی واعظ کو جلیس اپنا بنالیتا ہوں
لطف آتا نہیں ساقی مجھے میخواری کا

چشمِ بیمار تو ہر ایک سے ملتی ہے جلیلؔ
ہم سے ملنے میں مگر عذر ہے بیماری کا

ہمارا دل وہ گل ہے جس کو زلفِ یار میں دیکھا
جو زلفیں ہو گئیں برہم گلے کے ہار میں دیکھا

بہارِ گل کا عالم دیدۂ خونبار میں دیکھا
قفس میں بھی وہی دیکھا جو کچھ گلزار میں دیکھا

خلاصہ اس کو سمجھو سرگزشت طور و موسیٰ کا
مری آنکھوں نے جو کچھ جلوہ گاہِ یار میں دیکھا

بھلا گل کیا ترا ہمسر ہو جس کی یہ حقیقت ہے
ابھی گلشن میں دیکھا تھا ابھی بازار میں دیکھا

ہمیں تنکے نہیں چنتے ہوائے زلفِ پیچاں میں
صبا کو بھی پریشاں کوچۂ دلدار میں دیکھا

بصیرت جب ہوئی پیدا ہمیں مشقِ تصور سے
جو کچھ خلوت میں دیکھا تھا وہی بازار میں دیکھا

چمن میں اک بُتِ نازک ادا محوِ تماشا ہے
نیا گل آج ہم نے دامنِ گلزار میں دیکھا

دمِ نظارہ بھڑکی آتشِ شوق اور سینے میں
اثر کیسا یہ تیرے شربتِ دیدار میں دیکھا

جلیلؔ اک ناز کی قیمت دل و جاں دین و ایماں ہے
عجب اندھیر ہم نے حسن کے بازار میں دیکھا

بے پیے بھی ہے یہ ساقی اثرِ جامِ شراب
ہوش میں ہم نہیں پا کر خبرِ جامِ شراب

ہاتھ سے چھوٹ پڑا میرے پیالہ مے کا
چشمِ ساقی میں جو دیکھا اثرِ جامِ شراب

دن چلے، رات چلے، صبح چلے، شام چلے
ختم ہوتے نہیں دیکھا سفرِ جامِ شراب

بوئے گل میں ہے جو مستی وہ خبر دیتی ہے
کبھی گلشن میں ہوا تھا گزرِ جامِ شراب

محتسب نے مئے رنگیں پہ نہیں پھینکی ہے
خون ہو ہو کے بہا ہے جگرِ جامِ شراب

دامنِ ہوش پہ ہے قطرۂ مے کی بارش
خاک کر دے نہ جلا کر شررِ جامِ شراب

جامِ مے کو کبھی تنہا نہیں چلتے دیکھا
ہوش مستوں کا رہا ہمسفرِ جامِ شراب

میکدہ چھوڑ کے جانا کہیں مشکل ہے جلیلؔ
اب تو یہ سر ہے مرا اور درِ جامِ شراب

کیا حنا خونریز نکلی ہائے پس جانے کے بعد
بن گئی تلوار ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد

جام جم کی دھوم سے سارے جہاں میں ساقیا
مانتا ہوں میں بھی لیکن تیرے پیمانے کے بعد

شکریہ واعظ جو مجھکو ترکِ مے کی دی صلاح
غور میں اس پر کروں گا ہوش میں آنے کے بعد

شمع معشوقوں کو سکھلاتی ہے طرزِ عاشقی
جل کے پروانے سے پہلے بجھ کے پروانے کے بعد

آشنا ہوکر بتوں کے ہو گئے حق آشنا
ہم نے کعبے کی بنا ڈالی ہے بُت خانے کے بعد

میں کروں کس کا نظارہ دیکھ کر تیرا جمال
میں سُنوں کس کا فسانہ تیرے افسانے کے بعد

شمع محفل کا ہوا یہ رنگ ان کے سامنے
پھول کی ہوتی ہے صورت جیسے مرجھانے کے بعد

سچ یہ کہتے ہیں کہ ہنسنے کی جگہ دنیا نہیں
چشم عبرت ہیں چمن کے پھول مرجھانے کے بعد

فکر و کاوش ہو تو نکلیں معنیِ رنگیں جلیلؔ
لعل اگلتی ہے زباں خونِ جگر کھانے کے بعد

محوِ گلگشت ہو گر زیبِ چمن تو ہو کر
رنگ پھولوں کا خجالت سے اڑے بو ہو کر

اس پہ روتا ہوں کہ دل میں جو نہاں تھے اسرار
وہ بھی آنکھوں سے ٹپکنے لگے آنسو ہو کر

کس نے للچائی ہوئی آنکھ سے دیکھا ساقی
دیکھ ساغر سے اڑی جاتی ہے بو ہو کر

رشک ان پھولوں کی قسمت پہ مجھے آتا ہے
شب جو کرتے ہیں بسر زینتِ گیسو ہو کر

توڑنا گل کو ذرا سوچ سمجھ کر گلچیں
جان بلبل کی ہے پھولوں میں پڑی بو ہو کر

کثرتِ غم سے جو گھٹتا ہے دم ارمانوں کا
دل سے آنکھوں میں چلے آتے ہیں آنسو ہو کر

بکھرے بالوں میں الجھ کر یہ جبیں کہتی ہے
کس مصیبت میں ہوں ہمسایۂ گیسو ہو کر

گر یہی خندہ زنی گریۂ عشاق پہ ہے
سب کی آنکھوں سے وہ گر جائیں گے آنسو ہو کر

اس سخن سے ہوئی ظاہر یہ حقیقت کہ جلیل
دل میں کرتے ہیں اثر شعر بھی جادو ہو کر

پریشاں رخ پہ اپنے زلف عنبر فام کرتے ہیں
وہ مشتاقوں کی صبح زندگی کو شام کرتے ہیں

شباہت اس میں پاتے ہیں جو شیشے چشم ساقی کی
جھکا دیتے ہیں گردن احترام جام کرتے ہیں

مرا تقویٰ نہ پوچھو میں ہوں ان پرہیزگاروں میں
بہار آتے ہی جو توبہ کو نذر جام کرتے ہیں

جو ہیں آزاد وہ اہلِ قفس کا حال کیا جانیں
یہ کیونکر صبح کرتے ہیں یہ کیونکر شام کرتے ہیں

وہ مے سے کیا ہو ساقی میکدے سے ہو نہیں سکتا
سرِ محفل جو آنکھوں کے اشارے جام کرتے ہیں

شب ان کی ہے جو تیرا خواب دیکھیں اور دن ان کا
جو بیٹھے یاد تجھ کو صبح سے تا شام کرتے ہیں

گرے بجلی الٰہی خرمن صیّاد و گلچیں پر
بہار گل میں بلبل کو اسیر دام کرتے ہیں

بہار آئے چمن میں یا نہ آئے ان کو کیا پروا
وہ آئینے میں سیرِ عارضِ گلفام کرتے ہیں

جلیلؔ اس شان کے قرباں کہ اب آغازِ مے نوشی
تمہارا نام لے کر رندِ مے آشام کرتے ہیں

سبزۂ خط روئے رنگیں پر عیاں ہوتا نہیں
سچ تو یہ ہے آتشِ گل میں دھواں ہوتا نہیں

میں سراپا درد ہوں اس کی صراحت کیا کروں
درد ہوتا ہے کہاں ہمدم کہاں ہوتا نہیں

نکہتِ گل کی پریشانی نہ پوچھو باغ میں
اس طرح طائر کوئی بے آشیاں ہوتا نہیں

محتسب سے میکشی کا ڈھنگ سیکھا چاہیئے
مست ہے لیکن ذرا اُن پر گماں ہوتا نہیں

کس مزے کی آگ پھولوں میں لگی ہے دیکھنا
نذرِ آتش بلبلوں کا آشیاں ہوتا نہیں

چشم و دل کے چند پردے کیا چھپائیں گے اسے
حسن اس کا لاکھ پردے میں نہاں ہوتا نہیں

عشق کی دنیا الگ ہے ساری دنیا سے جہاں
یہ زمیں ہوتی نہیں یہ آسماں ہوتا نہیں

ساتھ چلنے دو مجھے اے رہروانِ کوئے دوست
کارواں میں کیا غبارِ کارواں ہوتا نہیں

کیوں نہ بلبل ہوں میں گلہائے معانی کا جلیلؔ
یہ چمن وہ ہے جو پامالِ خزاں ہوتا نہیں

قطرۂ اشک میں ہے لذتِ صد خم مجھکو
سوزِ دل ساز ہے نالہ ہے ترنم مجھکو

بادۂ وصل کے نشے نے کیا گم مجھکو
پا گیا میں تمھیں پاؤ گے نہ اب تم مجھکو

زخم کہتا ہے زمانہ نہیں ہمدردی کا
آنکھ روتی ہے تو آتا ہے تبسّم مجھکو

ہوش کو ساتھ نہ لینا تھا رہِ الفت میں
خود ہیں کھوئے ہوئے کر دیں نہ کہیں گم مجھکو

گل جو ہنستے ہیں ہنسیں سب پہ مبارک ان کو
اپنے ہی حال پہ آتا ہے تبسّم مجھکو

مسکرائے جو لبِ زخم تو غنچے نے کہا
کاش آجائے یہ اندازِ تبسّم مجھکو

کیا نظر آؤں کسی کو چمنِ عالم میں
بوتے گل ہوں میں لطافت نے کیا گم مجھکو

محفلِ ماتم و عشرت میں مری شرکت کیا
نالہ آتا ہے نہ آتا ہے ترنم مجھکو

نور آنکھوں کا بڑھایا جو ترے جلوے نے
نظر آنے لگے ذرّے مہ و انجم مجھکو

تنگ آکر میں رہا گوشۂ عزلت میں جلیلؔ
مثلِ عنقا مری شہرت نے کیا گم مجھکو

حسن ازل کی شان حسینوں میں آ کے دیکھ
آنکھیں خدا نے دی ہیں تو جلوے خدا کے دیکھ

کیا کر رہی ہے جام میں رکھی ہوئی شراب
ساقی اس آفتاب کو گردش میں لا کے دیکھ

دونوں جہاں میں تو نہ سمائی ہوئی تری
اے حسن یار اب مرے دل میں سما کے دیکھ

برق و شرر اگیں گے زمیں سے بجائے دل
تو خاک میں مرا دل مضطر ملا کے دیکھ

پردے یہ سامنے ہیں تو دیکھے گی کیا نگاہ
دونوں جہاں کو اپنی نظر سے گرا کے دیکھ

کیا پوچھتا ہے تو مری بربادیوں کا حال
تھوڑی سی خاک لے کے ہوا میں اڑا کے دیکھ

تجھ کو جو اپنی گرمی محفل کا ہے خیال
شب کو بجائے شمع کوئی دل جلا کے دیکھ

کس کس کو برق و باد اجاڑے گی باغ میں
ہر شاخ گل پہ ایک نشیمن بنا کے دیکھ

منظر بہت ہیں دید کے قابل یہاں جلیلؔ
تو بھی جنوں کو اپنا تماشا بنا کے دیکھ

ختم ہو جائیں گے سب دورِ وفا سے پہلے
وہ نہ آئے ہیں نہ آئیں گے قضا سے پہلے

صحنِ گلشن میں پہنچ کر مجھے حیرانی ہے
گل کو دیکھوں کہ ملوں بادِ صبا سے پہلے

ابر میں بادہ پرستوں کا جو ہوتا ہے ہجوم
محتسب آکے برستا ہے گھٹا سے پہلے

سونے والوں کو جگانے جو قیامت آئی
چونک اٹھا میں کسی چھاگل کی صدا سے پہلے

باغباں کون ہے گلگشتِ چمن میں مصروف
پھول ایسا تو کھلا تھا نہ صبا سے پہلے

پھر کسی تیغ کو چلنے کی نہ حاجت ہوگی
آپ چلئے تو ذرا ناز و ادا سے پہلے

دور چلنے میں ہے کچھ دیر ابھی اے ساقی
تو لٹا دے نگہہ ہوش ربا سے پہلے

چارہ گر چارہ گری خوب ہوئی کیا کہنا
شدّتِ درد نہ تھی ایسی دوا سے پہلے

سنتے ہیں قافلے والے سحر و شام جلیلؔ
ایک پر درد صدا بانگ درا سے پہلے

ہم دل بچا رہے تھے یہاں تیرِ ناز سے
چلتے ہوئے وہ باندھ کے زلفِ دراز سے

سب پوچھتے ہیں مجھ سے قیامت کب آئے گی
میں پوچھتا ہوں آپ کی رفتارِ ناز سے

رکھی شبِ وصال کو الجھا کے دو گھڑی
اتنا نہ ہو سکا تری زلف دراز سے

چھوٹی سی عمر میں ہیں وہ دلبر تو عیب کیا
سن کی کمی نکل گئی زلف دراز سے

دو میکدوں کا آج ہے نشہ دماغ میں
آنکھیں لڑا رہا ہوں کسی مستِ ناز سے

پہنچا جو ان کے در پہ تو اللہ رے اشتیاق
سجدے گرے تڑپ کے جبینِ نیاز سے

کرتی ہے خامشی مری عالم کو بدگماں
اخفائے راز کم نہیں افشائے راز سے

جادو بچا نہیں کوئی افسوں بچا نہیں
دل کیا بچے گا اس نگہِ فتنہ ساز سے

مے کی یہ بے خودی نہیں بات اتنی ہے جلیل
حاصل نیاز ہے مجھے اک مستِ ناز سے

کون میخوار نکالا گیا میخانے سے
شیشے مل مل کے گلے روتے ہیں پیمانے سے

عید کا جشن ہے رندوں میں بہار آنے سے
شیشے جھک جھک کے گلے ملتے ہیں پیمانے سے

جوشِ مستی میں جو میں سوئے چمن جاتا ہوں
پھول کرتے ہیں تواضع مری پیمانے سے

عشق میں ناموری داد خدا ہے ورنہ
شمع جلنے میں نہیں کم کسی پروانے سے

جان میری مے و ساغر میں پڑی رہتی ہے
میں نکل کر بھی نکلتا نہیں مے خانے سے

چند قطروں سے پڑی چشمۂ حیواں کی بنا
گر گئے تھے جو چھلکتے ہوئے پیمانے سے

ساتھ پینے کا مزہ کیا ہو کہ رشک آتا ہے
لب بہ لب تم ہو مرے سامنے پیمانے سے

آچلا آنکھ میں ساقی اثرِ مستیِ دل
راز شیشے کا کھلا جاتا ہے پیمانے سے

ابرِ رحمت نے لیا دوڑ کے سائے میں جلیل
مجھ کو دیکھا جو نکلتے ہوئے میخانے سے

ہاں جسے عاشقی نہیں آتی
لذّتِ زندگی نہیں آتی

جیسے اس کا کبھی یہ گھر ہی نہ تھا
دل میں برسوں خوشی نہیں آتی

جب سے بلبل اسیرِ دام ہوئی
کسی گل کو ہنسی نہیں آتی

سب شرابی مجھے کہیں تجکو
شرم اے بیخودی نہیں آتی

یوں تو آتی ہیں سیکڑوں باتیں
وقت پر ایک بھی نہیں آتی

سوچتا کیا ہے پی بھی لے زاہد
کچھ قیامت ابھی نہیں آتی

انتہا غم کی اس کو کہتے ہیں
زخم کو بھی ہنسی نہیں آتی

کوندتی ہے ہزار رنگ سے برق
پھر بھی شوخی تری نہیں آتی

صرف جب تک نہ خونِ دل ہو جلیلؔ
رنگ پر شاعری نہیں آتی

کیا جلد دن بہار کے یارب گزر گئے
بجلی ہوا سے پوچھ رہی ہے کدھر گئے

شاید اسی غرض سے چڑھے تھے نگاہ پر
وہ راہ پلک کے آنکھ سے دل میں اُتر گئے

وعدے کا نام لب پہ نہ آئے پیامبر
کہنا فقط یہی کہ بہت دن گزر گئے

اچھوں کا ہے بگاڑ بھی بہتر بناؤ سے
بکھرے تو اور بھی ترے گیسو سنور گئے

اک جلوہ گاہِ حسن بھی محشر نہ تھا جلیلؔ
کیا کیا حسیں ہماری نظر سے گزر گئے

حسن کی لائی ہوئی ایک بھی آفت نہ گئی
دل کی دھڑکن نہ گئی درد کی شدت نہ گئی

سایہ تک بھاگ گیا دیکھ کے وحشت گھر کی
کیا بلا ہے کہ الٰہی شب فرقت نہ گئی

حسن دلکش اسے کہتے ہیں کہ ہم ساری عمر
ان کو دیکھا کئے دیدار کی حسرت نہ گئی

اب بھی اس راہگزر میں ہے جہاں تھی پہلے
سچ تو یہ ہے نہ کہیں آئی قیامت نہ گئی

میں زمانے میں ہوں آئینۂ تصویر جلیل
کہ تصور سے کبھی یار کی صورت نہ گئی

حُسن آفت نہیں تو پھر کیا ہے
تُو قیامت نہیں تو پھر کیا ہے

وصل میں ان کی چشم خواب آلودؔ
میری قسمت نہیں تو پھر کیا ہے

جس پہ ہے صورت آفریں نازاں
تیری صورت نہیں تو پھر کیا ہے

مرکزِ آرزوئے گونا گوں
دل مصیبت نہیں تو پھر کیا ہے

زخم خنجر نظر نہیں آتا
یہ نزاکت نہیں تو پھر کیا ہے

لے کے دل ان کا مُسکرا دینا
دل کی قیمت نہیں تو پھر کیا ہے

نقطہ نقطہ بیاضِ ہستی کا
درسِ عبرت نہیں تو پھر کیا ہے

اشک بن کر جو آنکھ سے ٹپکے
دِل کی حسرت نہیں تو پھر کیا ہے

مغفرت مجھ سے بادہ کش کی جلیلؔ
شانِ رحمت نہیں تو پھر کیا ہے

تیرے شباب نے نہ مرے اضطراب نے
رسوا کیا مجھے دلِ خانہ خراب نے

کیا ظرف ان کا ہوگا جو پیتے ہیں ساقیا
میرے تو ہوش اڑا دیئے بوئے شراب نے

رُخ پر پڑی نقاب مجھے اس کا غم نہیں
غم تو یہ ہے کہ دیکھ لی صورت نقاب نے

اچھا کیا کہ خاک میں مجھ کو ملا دیا
چاہا تھا آپ کو اسی خانہ خراب نے

موسیٰ کو بھی ہے ناز کہ دیکھا جمالِ یار
دھوکا نہیں دیا کسے تیری نقاب نے

ہم سے تو چشم و دل میں وہ جلوہ نہ چھپ سکا
کیوں کر چھپا لیا رخِ جاناں نقاب نے

کہتا ہے دل کہ آنکھ نے ڈالا عذاب میں
اور آنکھ کہتی ہے دلِ خانہ خراب نے

دل نے تو اضطراب میں چھوڑا ہمارا ساتھ
چھوڑا نہ دل کا ساتھ مگر اضطراب نے

کیا خوف اس کو گردشِ ایام کا جلیلؔ
حلقے میں لے لیا جسے دورِ شراب نے

کسی کی آنکھ میں مستی اگر بھری ہوگی
تو وہ شباب کی ساری فسوں گری ہوگی

چھلک رہے ہیں جو ساغر ہماری آنکھوں کے
کسی نے نے کی پیالی کہیں بھری ہوگی

دل فسردہ کو چھینٹے ہزار دیں آنسو
جو شاخ سوکھ گئی ہے وہ کیا ہری ہوگی

جو توبہ کی ہے تو اب میکدے کو کیوں جائیں
کھنچی شراب صراحی بھری بھری ہوگی

ہوا سے شمع کا بجھنا تو اک بہانہ تھا
تمھارے سامنے غیرت سے جل مری ہوگی

دھرے ہیں شیشے یہ جس طرح ایک دن ساقی
ہماری توبہ یوں ہی طاق پر دھری ہوگی

ہوائے خلد کہاں میکدہ کہاں ساقی
یہ آہ سرد کسی مست نے بھری ہوگی

میں اشکِ خوں سے یونہی سینچتا رہوں گا جلیلؔ
کبھی تو شاخِ تمنا مری ہری ہوگی

خزاں میں یوں چمن سے بلبلِ ناشاد آتی ہے
پریشاں حال جیسے نکہتِ برباد آتی ہے

یہ دل میں اے خدا کس برق وش کی یاد آتی ہے
کہ بیتابی مجھے دینے مبارکباد آتی ہے

تصدق اس کرم کے میں کبھی تنہا نہیں رہتا
کہ جس دن تم نہیں آتے تمھاری یاد آتی ہے

مرے داغوں سے جلنے کا سبق لیتا ہے پروانہ
مرے نالوں سے بلبل سیکھنے فریاد آتی ہے

نہ حالت میری کچھ کہنا نہ مطلب نامہ بر کہنا
جو ممکن ہو تو یہ کہنا تمھاری یاد آتی ہے

گماں ہوتا ہے جنت کا اسے اجڑے نشیمن پر
قفس سے چھوٹ کر جب بلبلِ ناشاد آتی ہے

تصور جب کیا تصویرِ جاناں کھنچ گئی دل میں
تجھے صورت گری ایسی کہاں بہزاد آتی ہے

جلیلؔ آنکھوں کے پیمانے چھلک جاتے ہیں بھر بھر کر
وہ اگلی صحبتِ پیرِ مغاں جب یاد آتی ہے

سایۂ کوچۂ دلدار ملا قسمت سے
جیتے جی خلد کا گلزار ملا قسمت سے

یار دلدادۂ اغیار ملا قسمت سے

چارہ گر بھی مجھے بیمار ملا قسمت سے
راز میخانے کا حیران ہوں پوچھوں کس سے
جو ملا بے خود و سرشار ملا قسمت سے

درد میں لطف ہے ایذا میں مزا غم میں خوشی
دل مرا خوگرِ آزار ملا قسمت سے

شمع سے گل کا یہ رونا بھی عجب رونا ہے
گل ملا تجھ کو مجھے خار ملا قسمت سے

بڑھ کے پیمانے سے پی جائے کوئی کیا ممکن
ساقیٔ مست بھی ہشیار ملا قسمت سے

بخشش دینے پہ ہوئی دھوم تری رحمت کی
حشر میں مجھ سا گنہگار ملا قسمت سے

خاک جس دل کے لیے سارے جہاں کی چھانی
وہ کسی کے پسِ دیوار ملا قسمت سے

باز آیا کسی دلبر کی طلب سے میں جلیلؔ
ڈھونڈنے سے نہ ملا یار ملا قسمت سے

اُٹھا ہے ابر جوش کا عالم لیے ہوئے
بیٹھا ہوں میں بھی دیدۂ پرنم لیے ہوئے

ساقی کی چشم مست کا عالم نہ پوچھئے
اِک اِک نگاہ ہے کئی عالم لیے ہوئے

شبنم نہیں گلوں پہ یہ قطرے ہیں اشک کے
گزرا ہے کوئی دیدۂ پرنم لیے ہوئے

طے کر رہا ہوں عشق کی دشوار منزلیں
آہِ دراز و گریۂ پیہم لیے ہوئے

اُٹھ اے نقابِ یار کہ بیٹھے ہیں دیر سے
کتنے غریب دیدۂ پرنم لیے ہوئے

سنتا ہوں ان کی بزم میں چھلکیں گے آج جام
میں بھی چلا ہوں دیدۂ پرنم لیے ہوئے

موتی کی قدر سب کو ہے پھولوں کو دیکھئے
کیا ہنس رہے ہیں قطرۂ شبنم لیے ہوئے

جوشِ جنوں میں لطفِ تصور نہ پوچھئے
پھرتے ہیں ساتھ ساتھ انھیں ہم لیے ہوئے

دل کی لگی نہ ان سے بجھی آج تک جلیلؔ
دریا ہیں گرچہ دیدۂ پرنم لیے ہوئے

جام جب تک نہ چلے ہم نہیں ٹلنے والے
آج ساقی ترے فقرے نہیں چلنے والے

نام روشن جو ہوا حسن میں پروانوں سے
شمع کہتی ہے کہ ٹھنڈے رہیں جلنے والے

کیا حکومت مرے ساقی کی ہے میخانے میں
جتنے ساغر ہیں اشارے پہ ہیں چلنے والے

فتنے اُٹھ اُٹھ کے یہ کہتے ہیں کہ او مستِ خرام
ہم بھی سائے کی طرح ساتھ ہیں چلنے والے

فائدہ کیا ہوسِ دل کے بڑھانے سے جلیلؔ
وہی نکلیں گے جو ارماں ہیں نکلنے والے

عشق میں ہائے ستم ہم نے سہے کس کس کے
خاک میں گردشِ قسمت سے ملے پِس پِس کے

یار پھر آگئی قاتل کی خدا خیر کرے
خون پھر دینے لگے زخمِ جگر رِس رِس کے

ان حسینوں سے خدا سابقہ ڈالے نہ کبھی
سب کو برباد کیا دل میں رہے جِس جِس کے

آپڑے ہیں ترے قصروں میں جو عشاق کے دل
رنگ لائیں گے کبھی مثلِ حنا پِس پِس کے

جی میں آتا ہے کہ لکھے کو مقدر کے جلیلؔ
میں مٹا دوں درِ جاناں پہ جبیں گھِس گھِس کے

عشق کی فیاضیاں ہیں کس قدر میرے لیے
دردِ دل میرے لیے دردِ جگر میرے لیے

رشک کی کیا بات ہے اے شمع کوئی کیوں جلے
سوزِ دل تیرے لیے سوزِ جگر میرے لیے

کیا خطِ تقدیر ہے اپنا تصدق جائیے
ایک پرزہ بھی نہ لایا نامہ بر میرے لیے

رنگ پروانے کا جب دیکھا تو بولی شمعِ بزم
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے سوزِ جگر میرے لیے

کیا یہی آئین میخانے کا ہے پیرِ مغاں
جامِ مے سب کے لیے ہے چشمِ تر میرے لیے

ہو کے عصیاں سے خجل دیکھا یہ میں نے حشر میں
چشمۂ رحمت بنی ہے چشمِ تر میرے لیے

اشک ٹپکے اور رسوائی کا دفتر کھل گیا
ایک طوفانِ بلا ہے چشمِ تر میرے لیے

رنگ لائی ہر طرف فصلِ بہاری اے جلیلؔ
گل ہیں بلبل کے لیے داغِ جگر میرے لیے

غضب ہوتا تری صورت جو بے پردہ کہیں ہوتی
کہ تجھ پر جو نظر پڑتی نگاہِ واپسیں ہوتی

سجود آستانِ یار سے سیری نہیں ہوتی
کیے جاتے جبیں سائی اگر باقی جبیں ہوتی

ہمیں معلوم تھے سب پیچ گھونگھریالے بالوں کے
لگاتے ہاتھ کاکل تو مار آستیں ہوتی

تم آتے یا نہ آتے وصل کا وعدہ تو کر لیتے
یہ کیا کم تھا کہ تسکین دلِ اندوہگیں ہوتی

یہی اک شکل تھی قسمت کے لکھے کو مٹانے کی
کسی کا سنگِ در ہوتا مری لوحِ جبیں ہوتی

کیا بسمل جسے دیکھا، ہوا کشتہ جسے تاکا
نظر تلوار ہوتی ہے مگر ایسی نہیں ہوتی

مزہ ہوتا جو دونوں کی خبر دستِ جنوں لیتا
نہ دامن آپ کا ہوتا نہ میری آستیں ہوتی

جلیل اس در پہ مر جاتے تو بیڑا پار ہو جاتا
میسر کوچۂ جاناں میں تھوڑی سی زمیں ہوتی

کہوں کیا ماجرا اپنا حقیقت ہے عیاں میری
اداسی حال ہے میرا خموشی ہے زباں میری

نہ دیکھا بزم محشر کو بھی حسن و عشق سے خالی
کہیں قصے تمھارے ہیں کہیں ہے داستاں میری

بچھڑ کر کارواں سے بھی اکیلا میں نہیں رہتا
رفیقِ راہ بن جاتی ہے گردِ کارواں میری

یہ دھبے خونِ ناحق کے نہیں ہیں جا بجا قاتل
ترے دامن پہ سرخی سے لکھی ہے داستاں میری

خوشی ہو جائے گی ان کی انہیں کی نذر کرنے دے
اجل تو کیا کرے گی لے کے جانِ ناتواں میری

انہیں دیکھو چھپے بیٹھے ہیں کس گوشے میں پردے میں
مجھے دیکھو نگاہِ شوق پہنچی ہے کہاں میری

زمانہ جانتا ہے کشتۂ تیغِ جدائی ہوں
بیاں ہوتی ہے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر داستاں میری

چمن میں دام لے کر کون آیا گیسوؤں والا
بلائیں لیتی ہے جھک جھک کے شاخِ آشیاں میری

جلیلؔ افسردہ حالی پر وہ ہنستے ہیں تو ہنسنے دو
مزہ دے جائے گی مل کر بہار ان کی خزاں میری

ٹپکتے ہیں شبِ غم دل کے ٹکڑے دیدۂ تر سے
سحر کو کیسے کیسے پھول چُنتا ہوں مَیں بستر سے

کیا ہے مل کے دونوں نے جو رسوا دخترِ رز کو
کھنچی بیٹھی ہے شیشے سے بھری بیٹھی ہے ساغر سے

الٰہی آگ برقِ طور نے کیسی لگائی تھی
نکلتے ہیں شرارے آج تک ایک ایک پتھر سے

نظر پڑتی ہے تم پر سب کی مجھ کو رشک آتا ہے
چلو خلوت میں چل بیٹھیں نکل کر بزمِ محشر سے

لگی ہے اس سے رِندوں کی جو آنکھیں اک تماشا ہے
کہ ساغر ہی میں آجاتی ہے جو گرتی ہے ساغر سے

بہت چوکے جو اُن سے عشق کا اظہار کر بیٹھے
گرے ہم یوں نظر سے جیسے آنسو دیدۂ تر سے

وہ بزمِ مے میں آتے ہیں تو مے کا جوش کیا کہیے
اُبل پڑتی ہے شیشے سے چھلک جاتی ہے ساغر سے

وہ کشتہ ہوں کہ میرے قتل کا جب ذکر آتا ہے
ٹپک پڑتی ہیں کچھ بوندیں لہو کی ان کے خنجر سے

جلیلؔ اچھا نہیں آنا اِدھر یہ بزمِ صہبا ہے
کہیں توبہ نہ ٹوٹے آپ کی ٹکرا کے ساغر سے

گرچہ دل میں کوئی پیکاں نہیں قاتل باقی
لوٹتا ہوں کہ ابھی ہے خلشِ دل باقی

بجھ گئی آتشِ گل بادِ خزاں کے ہاتھوں
رہ گئی گرمیِ فریادِ عنادل باقی

اس تصور سے کہ ہنگامِ سحر کیا ہوگا
شمع گھلتی رہی جب تک رہی محفل باقی

بند ہے در جو قفس کا یہ پتہ دیتا ہے
ہے ابھی قوتِ پروازِ عنادل باقی

جان سے جاؤں تو پہنچوں میں درِ جاناں تک
رہ گئی ہے یہی اک عشق کی منزل باقی

جس طرح پارۂ اخگر ہو نہ ہو خاکستر
دل ہوا خاک مگر ہے تپشِ دل باقی

مٹ گئے ہم تو مگر عشق کہاں مٹتا ہے
وہی سودا ہے وہی سر ہے وہی دل باقی

خون آنکھوں سے ٹپکتا ہے تو خوش ہوتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ ابھی ہیں جگر و دل باقی

شرکتِ بزمِ سخن کیجئے کیونکر کہ جلیلؔ
وہ امنگیں ہیں نہ وہ جوش نہ وہ دل باقی

صحرا کے لیے دل ہے نہ گلشن کے لیے ہے
یہ پھول تو موزوں ترے دامن کے لیے ہے

اے آتشِ غم دل کو نہ تو ہاتھ لگانا
پروانہ یہ شمعِ رخِ روشن کے لیے ہے

بلبل سے مخالف ہے ہوا سارے چمن کی
تنکا ہے مگر برقِ نشیمن کے لیے ہے

صیاد کی نظروں میں ہوں نظروں میں رہوں گا
بیکار مجھے فکرِ نشیمن کے لیے ہے

پیاری نگہِ لطف بھی ہے چشمِ غضب بھی
اِک میرے لیے اک مِرے دشمن کے لیے ہے

میں ہوں صفتِ نکہتِ گل طائرِ آزاد
ہر شاخِ چمن میرے نشیمن کے لیے ہے

شعلے سے لپٹ کر بھی رہے جلنے سے محفوظ
یہ بات نقابِ رخِ روشن کے لیے ہے

کس لطف سے کہتا ہے جنوں طوق پنہ
یہ ہار جلیلؔ آپ کی گردن کے پ

دشتِ ایمن کی ضیا ساقی کے میخانے میں ہے
آگ جو موسیٰ نے دیکھی تھی وہ پیمانے میں ہے

شمع بھی جلتی ہے پروانہ بھی جلتا ہے مگر
شمع میں ہے وہ کہاں جو سوز پروانے میں ہے

ظرف تو سب ہو گئے خالی مگر کیوں ساقیا
وہ بچا رکھی ہے جو آنکھوں کے پیمانے میں ہے

سب کو بھولا آپ کو بھولا تجھے بھولا نہیں
اب بھی اتنی ہوشیاری تیرے دیوانے میں ہے

مجھکو اس مے کی طلب لائی ہے اے پیرِ مغاں
جو صراحی میں نہ شیشے میں نہ پیمانے میں ہے

تو جو آیا جان آئی تو گیا دل بھی گیا
اک خوشی آنے میں تیرے اک خوشی جانے میں ہے

رنگ پاتا ہوں وہی جوشِ شباب یار کا
کیفیت جو ساغرِ مے کے چھلک جانے میں ہے

روئے ساقی کا ہے جس میں عکس کیف اس کا نہ پوچھ
لاکھ پیمانوں کی مستی ایک پیمانے میں ہے

کیا بتائے بیخودی کی دھن میں رہتا ہے جلیلؔ
پوچھتا ہوں جب اسے سنتا ہوں میخانے میں ہے

ہم دیکھنے والے تری مستانہ ادا کے
ساقی نہیں محتاج مئے ہوشربا کے

پلکیں ہیں بلا ۔ آنکھ بلا ۔ زلف بلا ہے
کیونکر نہ کہیں سب کہ حسیں تم ہو بلا کے

ہم ہیں کہ بسر کرتے ہیں بے لاگ چمن میں
گلچیں کے مخالف نہ ہوا خواہ صبا کے

تو لاکھ چھپے لاکھ مرا خون چھپائے
چھپتے ہیں کہاں زخم تری تیغِ ادا کے

مصروف ہے آرائشِ گلشن میں کچھ ایسی
ٹکتے ہی نہیں پاؤں کہیں بادِ صبا کے

ہم تو اسی نوشش کے قائل ہیں جو پی لے
دو گھونٹ شرابِ نگہہِ ہوشربا کے

چہرے پہ بکھرنا نہ گیا زلفِ دوتا کا
کہتے ہی رہے وہ کہ تھکیں ہاتھ صبا کے

جام و مے و مینا کی حقیقت ہمیں معلوم
سب ہیں یہ کرشمے نگہہِ ہوشربا کے

قاتل پہ جلیل آ نہیں سکتا کوئی الزام
کام اس کی ادا کرتی ہے پردے میں قضا کے

غیر الفت کا راز کیا جانے
لطف ناز و نیاز کیا جانے

نیم جانوں پہ کیا گزرتی ہے
نرگس نیم باز کیا جانے

میرے طولِ شب جدائی کو
تیری زلف دراز کیا جانے

پاکبازانِ میکدہ کا مقام
جو نہ ہو پاکباز کیا جانے

دل ہے اس پردہ میں کوئی ورنہ
شمع سوز و گداز کیا جانے

ہم جو مستی میں گرتے پڑتے ہیں
زاہد ایسی نماز کیا جانے

راہِ الفت نہ جس نے طے کی ہو
وہ نشیب و فراز کیا جانے

دوست کی قدر دوستی کا نباہ
دوست دشمن نواز کیا جانے

جس کے دل میں نہ سوز ہو وہ جلیلؔ
کیف آواز ساز کیا جانے

چال ایسی وہ شوخ چلتا ہے
حشر کا جس پہ دم نکلتا ہے

اشک خوں کیوں نہ آنکھ سے ٹپکیں
دل کا ارماں یوہیں نکلتا ہے

ساقیا ایک جام کے چلتے
کتنے پیاسوں کا کام چلتا ہے

میں کسی سرزمیں کا قصد کروں
آسماں ساتھ ساتھ چلتا ہے

ہائے گردش وہ چشم ساقی کی
میں یہ سمجھا کہ جام چلتا ہے

سرو ہے نام نخل الفت کا
پھولتا ہے کبھی نہ پھلتا ہے

کیا زمانہ بھی ہے اسیر ترا
کہ اشارے پہ تیرے چلتا ہے

تیر دل کا نہ کھینچ رہنے دے
لطف صحبت سے جی بہلتا ہے

شعر رنگیں نہ سمجھو ان کو جلیلؔ
طوطئ فکر لعل اُگلتا ہے

مفت میں توڑ کے رکھ دی مری توبا تو نے
کام پتھر کا کیا شیشۂ صہبا تو نے

میں نے کی جامہ دری اور انھیں شکوہ ہے
کر دیا چاک مرے حسن کا پردا تو نے

کس قدر ہوش رُبا ہے نگہ مست تری
اس کو دیکھا نہ سنبھلتے جسے دیکھا تو نے

تو نگاہوں میں، تصور میں، جگر میں، دل میں
فائدہ کیا جو کیا آنکھ سے پردا تو نے

ہم نہ کہتے تھے نہیں طاقت دیدار جلیلؔ
کیا ہوا جلوہ گہ ناز میں دیکھا تو نے

ایک دل ہے کہ نہیں درد سے دم بھر خالی
ورنہ کیا کیا نظر آئے نہ بھرے گھر خالی

مے نہ پائے تو کوئی زندہ رہے کیا ساقی
انتہا یہ ہے کہ چلتا نہیں ساغر خالی

ایک زنجیر میں اس زلف نے باندھا اس کو
نہیں سودائے محبت سے کوئی سر خالی

نہیں معلوم کب آئے گی بہار اے ساقی
دیکھے جاتے نہیں اب شیشہ و ساغر خالی

رنگ ہم دیکھ چکے گلشن ہستی کا جلیل
بوئے حسرت سے نہیں کوئی گل تر خالی

ان کو خرامِ ناز کی عادت نہیں رہی
برپا گلی میں قیامت نہیں رہی

آنسو ہمارے گر گئے ان کی نگاہ سے
ان موتیوں کی اب کوئی قیمت نہیں رہی

اِس بُت کا بے نقاب نکلنا غضب ہوا
توبہ کسی کی آج سلامت نہیں رہی

اچھا کیا کہ خاک میں ہمکو ملا دیا
اب تو تمھارے دل میں کدورت نہیں رہی

دیکھا تجھے تو شوق مرا اور بڑھ گیا
کیونکر کہوں کہ اب کوئی حسرت نہیں رہی

ناصح سے یہ کہو کہ نہ تکلیف کیجئے
مجھکو خیالِ یار سے فرصت نہیں رہی

آنکھیں تری ہر ایک سے ملتی ہیں بے حجاب
ان آہوؤں میں اب کوئی وحشت نہیں رہی

رکھتے وہ اپنے دیدۂ و دل میں جلیل کو
افسوس ہے کہ قدرِ محبت نہیں رہی

رنگِ چمن جنوں کا ہے ساماں کیے ہوئے
گُل ہنس رہے ہیں چاکِ گریباں کیے ہوئے

مستی مری تھی بادہ و ساغر سے بے نیاز
بے خود رہا تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

میں جانتا ہوں دل ہے کسی خوش نصیب کا
اِک پھول ہیں وہ زیبِ گریباں کیے ہوئے

دل کر رہا ہے جس قدر اظہارِ دردِ عشق
اس سے ہزار چند ہے پنہاں کیے ہوئے

مصروفِ جشنِ بادِ صبا ہے بہار میں
ہر شاخِ گُل کو سروِ چراغاں کیے ہوئے

سارے جہاں میں جلوہ نما ہے وہ خود نما
سارے جہاں سے آپ کو پنہاں کیے ہوئے

لیتے رہے قفس میں مزے آشیاں کے ہم
دامن کو اشکِ خوں سے گلستاں کیے ہوئے

اتنی سی بوئے زلف ہے اِک عمر سے جلیلؔ
مجموعۂ حواس پریشاں کیے ہوئے

چلے ادا سے جو تم شان اور ہی ہو گی
حنا تو کیا ہے قیامت بھی پس گئی ہو گی

برہنہ ہو کے تری تیغ جب چلی ہو گی
رگِ گلو تھی حیادار کٹ گئی ہو گی

تمہارے سامنے کیوں شمع بجھتی کیا باعث
یہ رعبِ حُسن سے خاموش ہو گئی ہو گی

چٹکتے غنچے نہیں ساقیا گلستاں میں
بہار کے ہیں یہ دن توبہ ٹوٹتی ہو گی

ہماری توبہ کا کیا ذکر میکدے میں جلیلؔ
شکستہ حال کسی گوشہ میں پڑی ہو گی

شباب ہو کہ نہ ہو حسنِ یار باقی ہے
یہاں کوئی بھی ہو موسم بہار باقی ہے

کچھ ایسی آج پلائی ہے چشمِ ساقی نے
نہ ہوش ہے نہ کوئی ہوشیار باقی ہے

پکارتا ہے جنوں ہوش میں جو آتا ہوں
ٹھہر ٹھہر ابھی فصلِ بہار باقی ہے

کمالِ عشق تو دیکھو وہ آگئے لیکن
وہی ہے شوق وہی انتظار باقی ہے

کسی شراب کی ہو کیا طلب جلیلؔ مجھے
مئے الست کا اب تک خمار باقی ہے

خرام ناز میں شوخی بھی ہے شرارت بھی
حنا بھی پس گئی رفتار ہر قیامت بھی

پڑا ہے تم پہ کسی بے قرار کا سایہ
نظر بھی شوخ ہے بے چین ہے طبیعت بھی

قدم قدم پہ وہ فتنے اٹھاتے چلتے ہیں
یہی ہے رنگ تو آجائے گی قیامت بھی

چمن کی سیر مری آنکھ سے کوئی دیکھے
کلی کلی میں تری بو بھی ہے نزاکت بھی

پلے ہوئے ترے دامن کے سارے فتنے ہیں
لگی ہوئی ترے قدموں سے ہے قیامت بھی

جو داغِ دل میں ہے سُرخی وہ اور ہی سے ہے
حنا کا رنگ بھی دیکھا ہے گل کی رنگت بھی

کشش یہ حسن کی دیکھو کہ بہر نظارہ
اِدھر ہم آئے اُدھر آ گئی طبیعت بھی

ادا سے چلتے ہوئے آرہے ہیں محشر میں
وہ چاہتے ہیں کہ پامال ہو قیامت بھی

جلیلؔ خیر تو ہے کس سے دل لگا آئے
کہ تر ہے آنکھ بھی بدلی ہوئی ہے صورت بھی

نغمہ سنجی ہے قفس میں وہی صیاد ابھی
بلبلوں کو ہے گلستاں کا سبق یاد ابھی

کون بلبل کو قفس میں تھا لٹانے والا
صرف اک نکہتِ گل آئی تھی صیاد ابھی

رکھ دیا پھاڑ کے پھولوں نے گریباں اپنا
کہہ گئی کان میں کچھ بلبلِ ناشاد ابھی

طرزِ رفتارِ صبا ہے جو یہی گلشن میں
ہوگی برباد بہت نکہتِ برباد ابھی

ہائے پھر چھیڑ دیا ذکرِ گلستاں تو نے
خشک آنسو نہ ہوئے تھے مرے صیاد ابھی

ہو گئے نذرِ خزاں پھول ہزاروں لیکن
رنگ پر ہے چمنِ عالمِ ایجاد ابھی

شمعِ مدفن تھی خدا جانے کہ وہ شیریں تھی
کوئی روتا تھا سرِ تربتِ فرہاد ابھی

رفتہ رفتہ مجھے اندازِ فغاں آئے گا
باغ چھوڑے ہوئے کے دن ہوئے صیاد ابھی

ہم سے رندوں کی دعاؤں کا اثر ہے کہ جلیلؔ
شیشہ و جام سے ہے میکدہ آباد ابھی

آخری دَور

گرمیاں اب وہ نہیں دل کی خدا خیر کرے
شمع بجھنے کو ہے محفل کی خدا خیر کرے

پھنسا کے دام میں پیری کے بیکس و تنہا
کہاں گئی مری عمرِ رواں نہیں معلوم

عاشقی کیا ہے رہینِ غمِ جاناں ہونا
زندگی کیا ہے قتیلِ شبِ ہجراں ہونا

طلبِ یار ہے کیا اپنی خودی سے جانا
شوقِ دیدار ہے کیا موت کا خواہاں ہونا

پوچھتے کیا ہو تم آشفتہ مزاجی میری
زلف کو کس نے سکھایا ہے پریشاں ہونا

شوقِ دیدار لکھا تھا یہ جواب آیا ہے
سیکھ پہلے صفتِ آئینہ حیراں ہونا

پھول گلزار کے سب جامہ دری سیکھ گئے
آگیا کام مرا چاکِ گریباں ہونا

منحصر تھا تری زلفوں کے بکھر جانے پر
کسی شیرازۂ ہستی کا پریشاں ہونا

گل بداماں تو گلستاں ہو مگر وائے نصیب
گل کی تقدیر میں ہو خار بداماں ہونا

ہو بہو ہستیِ موہوم کا نقشہ ہے جلیلؔ
گل کا دم بھر کے لیے باغ میں خنداں ہونا

جب سے خوگر میں ہوا بادیہ پیمائی کا
ایک اِک آبلہ آئینہ ہے رسوائی کا

کوئی کیا جانے کہ ہے روز قیامت کیا چیز
دوسرا نام ہے میری شب تنہائی کا

اشک کی بوند نے ٹپکی ہے جو چشم تر سے
رکھ دیا کھول کے دفتر مری رسوائی کا

جان دینے میں نہیں عذر مگر شرط یہ ہے
جان لینے میں ہے انداز مسیحائی کا

کیا سنوارا ہے تجھے حُسن کی مشاطہ نے
ہر خم زلف میں دل ہے کسی سودائی کا

کیا قیامت ہے کہ سوتی ہے قیامت اب تک
منھ پہ ڈالے ہوئے آنچل شب تنہائی کا

رونا آتا ہے مجھے اپنی شکستِ دل پر
آئینہ ٹوٹ گیا ان کی خود آرائی کا

ملتی جلتی ہے قیامت سے شباہت لیکن
اِک ذرا رنگ ہے گہرا شب تنہائی کا

مجھکو کیا پھول کھلے ہیں جو گلستاں میں جلیلؔ
میں ہوں خوگر چمنِ گوشۂ تنہائی کا

کسی کا حُسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظامِ عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

نگاہِ لطف نہیں ان کی خیر ہے ورنہ
کچھ اور حال ہمارا خراب ہو جاتا

ابھرنے دیتی نہ یادِ شراب پھر مجھ کو
شراب چھوڑ کے غرقِ شراب ہو جاتا

جو موت کا نہ محبت میں آسرا ہوتا
کسی حسین پہ مرنا عذاب ہو جاتا

لب ان کے چومتے ساغر یہ کب گوارا تھا
شراب پیتے وہ ہیں آب آب ہو جاتا

جو آپ آتے تو دنیا مری بدل جاتی
خوشی ملال سکوں اضطراب ہو جاتا

اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسمِ جہاں
مری نگاہ میں دھندلا سا خواب ہو جاتا

ترے خیال کو دل سے دعائیں دیتے ہیں
اکیلے ہوتے تو جینا عذاب ہو جاتا

وہ آنے والے ہیں شب کو یہ چاہتا ہوں جلیلؔ
غروبِ شام سے قبل آفتاب ہو جاتا

درد کا دل میں ٹھکانا ہوگیا
زندگی بھر کا تماشا ہوگیا

مبتلائے درد ہم بھی ہوگئے
ان کا ہنس دینا بہانا ہوگیا

بے خبر گلشن تھا میرے عشق سے
غنچے چٹکے راز افشا ہوگیا

ماہ و انجم پر نظر پڑنے لگی
ان کو دیکھے اک زمانا ہوگیا

تھے نیاز و ناز کیا کیا خواب میں
کھل گئیں آنکھیں تو پردا ہوگیا

تیرے جلووں کا عالم کیا کہوں
ایک عالم اور پیدا ہوگیا

اپنی رسوائی سے ہے بڑھ کر یہ غم
ساتھ میرے تو بھی رسوا ہوگیا

درد دل میں کروٹیں لینے لگا
کس کی آنکھوں کا اشارا ہوگیا

ذکر مے آیا جو گلشن میں جلیلؔ
پھول ساغر سرو مینا ہوگیا

ان کے قدموں پہ جو سر لوٹ گیا
دل کو وجد آیا جگر لوٹ گیا

منتظر دل تھا اسی کا گویا
وہ ادھر اٹھے ادھر لوٹ گیا

سب تو کرتے رہے کعبے کا طواف
میں سمجھ کر ترا در لوٹ گیا

دل کو آیا تھا لٹانے دل پر
خود ترا تیرِ نظر لوٹ گیا

ایک ہم لیتے خبر کس کس کی
دل کو تھاما تو جگر لوٹ گیا

ابر اٹھا تھا بڑے دعوے سے
دیکھ کر دیدۂ تر لوٹ گیا

میں کہاں حسن کا نظارہ کہاں
کھا کے اک تیرِ نظر لوٹ گیا

آبرو جب نہ رہی اشکوں کی
خاک پر دیدۂ تر لوٹ گیا

کھینچتا تھا نہ تجھے آہ جلیل
تھام کر کوئی جگر لوٹ گیا

نظر جب سے ملی ان کی نظر سے دل نہیں ملتا
نشانِ ہوش رفتہ بھی کہیں منزل نہیں ملتا

محیط عشق کی وسعت نہ پوچھو مختصر یہ ہے
مری ہستی کی موجوں کو کوئی ساحل نہیں ملتا

کہاں پھر لذتیں یہ جستجوئے نامکمل کی
غنیمت ہے نشانِ جادۂ منزل نہیں ملتا

چمن سے بوئے گل نکلی یہ کہہ کر موسم گل میں
بھری محفل میں لطفِ گرمیِ محفل نہیں ملتا

عجب سنسان راہِ عشق ہے اِک ہو کا عالم ہے
کوئی منزل رسیدہ بھی سرِ منزل نہیں ملتا

مٹا دی آ کے تو نے شمع کی وہ گرم بازاری
کوئی پروانہ اب اس کو سرِ محفل نہیں ملتا

مجھے کیا تشنگی مجھ تشنہ لب کی جب یہ عالم ہے
کہ دریا تو بہت ہیں کوئی دردِ دل نہیں ملتا

تڑپ کر دل سرِ منزل پہنچتا ہے جو دم بھر میں
نظر کہتی ہے لطف دوریِ منزل نہیں ملتا

جلیلؔ اُن کا نہ ملنا ہی ہے بہتر ایسے ملنے سے
وہ ملتے ہیں نظر ملتی ہے لیکن دل نہیں ملتا

ساری خوبی ہے ان آنکھوں میں مروّت کے سوا
ساری دنیا ہے نظر میں مری حالت کے سوا

حشر میں میرے گناہوں کی سمائی ہے محال
اتنی وسعت ہے کہاں دامن رحمت کے سوا

ہائے اس دل میں جو گنجینہ تھا ارمانوں کا
کچھ نہ چھوڑا غمِ جانان نے محبت کے سوا

کیا کہوں جلوہ گہہ ناز میں کیا کیا دیکھا
میں نے دیکھا ہی نہیں کچھ تری صورت کے سوا

کچھ کرم کی بھی جھلک ان کا ستم دیتا ہے
شکر بھی میری زباں پر ہے شکایت کے سوا

کیا قیامت ہے گئے دید کا وعدہ کر کے
ہاتھ آتے ہیں کہاں اب وہ قیامت کے سوا

پھول کہہ دینے سے افسردہ کوئی ہوتا ہے
سب ادائیں تری اچھی ہیں نزاکت کے سوا

سابقہ پڑنے سے یہ راز سمجھ میں آیا
ہر زمانہ گزراں ہے شبِ فرقت کے سوا

جلوۂ حسن تو ہے دید سے بے پردہ جلیلؔ
کون اب مانعِ دید ہے حیرت کے سوا

محبت میں تڑپنا لوٹنا اب تک نہیں آیا
مجھے مر مر کے جینے کا مزا اب تک نہیں آیا

نہ پوچھو کیا نقاب اُٹھنے پہ دیکھا مختصر یہ ہے
کہ قابو میں دلِ مضطر مرا اب تک نہیں آیا

سمجھتا ہوں اسے بھی میں اثر تیری نزاکت کا
کہ میرے لب پہ حرفِ مدعا اب تک نہیں آیا

حیات و مرگ کی رفتار میں کچھ فرق لازم ہے
دم آیا لب پہ لیکن دلربا اب تک نہیں آیا

کہیں یہ بھی نہ مثلِ عمرِ رفتہ بے وفا نکلے
کہ قاصد کو زمانہ ہو گیا اب تک نہیں آیا

سکونِ دل سی شے کس نے اڑا لی نام لوں کس کا
کوئی دل میں محبت کے سوا اب تک نہیں آیا

ہزاروں رنگِ فطرت لے کے گو شباب ان کا
مگر رخسار پر رنگِ وفا اب تک نہیں آیا

ابھی کچھ اور مشقِ جاں ستانی کی ضرورت ہے
ادا کا رنگ تجھ میں اے صبا اب تک نہیں آیا

خم و مینا و ساغر پر یہ لکھا ہے کہ اس گھر میں
جلیلؔ ایسا سبو کش دوسرا اب تک نہیں آیا

حسن کہتا ہے فدائے رخِ جاناں ہو جا
شان کہتی ہے کہ ہر آن پہ قرباں ہو جا

اے دل آشفتہ خیالی سے تو بہتر یہ ہے
زلف بن جا کسی چہرے پہ پریشاں ہو جا

لوٹنا دل کو سکھایا تھا نظر کو پہلے
اب یہ کہتے ہیں کہ غارت گرِ ایماں ہو جا

حالتِ زخمِ دروں اس کو دکھاؤں کیونکر
تو ہی اے خونِ دل اشکوں سے نمایاں ہو جا

ہاتھ یوں دولتِ دیدار کہاں آتی ہے
آئینہ بن ہمہ تن دیدۂ حیراں ہو جا

فصلِ گل آئی ہوئی دستِ جنوں کو تحریک
دامنِ ہوش سے کہہ دو کہ گریباں ہو جا

کوہ و صحرا کی ہوا کھاتے زمانہ گزرا
اب تو اے صبحِ دکن شامِ غریباں ہو جا

چاہتا ہوں اسے دیکھے نہ کوئی میرے سوا
نگہِ شوق نقابِ رخِ جاناں ہو جا

موسمِ گل کی ہوا خود ہے جنوں خیز جلیلؔ
کس نے گل سے یہ کہا چاک گریباں ہو جا

دل انھیں بار دگر یاد آیا
ڈھا چکے گھر کو تو گھر یاد آیا

بے خودی کا ہے میری یہ عالم
تیغ کو دیکھ کے سر یاد آیا

کس قدر مجھکو دلِ سوختہ آج
دیکھ کر شمعِ سحر یاد آیا

ہچکیاں نزع میں کیوں آنے لگیں
کس کو میں وقتِ سفر یاد آیا

مر کے یاد آئے مزے دنیا کے
گھر سے نکلے تھے کہ گھر یاد آیا

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر
کیا کریں گے میں اگر یاد آیا

تابشِ مہرِ قیامت کو جلیلؔ
دیکھ کر دامنِ تر یاد آیا

عیشِ منزل دل بنایا جائے گا
آپ کے قابل بنایا جائے گا

بحرِ غم سے پار ہونے کے لیے
موت کو ساحل بنایا جائے گا

وہ چمن میں گر یوں ہی آتے رہے
ہر کلی کو دل بنایا جائے گا

برق ہوں کوئی نہ میں سیماب ہوں
کیوں مجھے بسمل بنایا جائے گا

درد کچھ بیکار پہلو میں نہیں
دوسرا اک دل بنایا جائے گا

ڈھونڈتی ہے کس کو یہ تیری نظر
کس کے دل کو دل بنایا جائے گا

سعیِ لاحاصل کو اب تو اے جلیلؔ
عشق کا حاصل بنایا جائے گا

دل کے ارماں کو محبت میں نکھرنے نہ دیا
ہائے اتنا بھی لہو زخمِ جگر نے نہ دیا

شکر ہے باندھ لیا اپنے کھلے بالوں کو
اس نے شیرازۂ عالم کو بکھرنے نہ دیا

اس کی ہر بوند میں سو بحر کی گہرائی ہے
موج مے نے کسی ڈوبے کو ابھرنے نہ دیا

کشتیِ موج پہ پھولے تھے حبابِ دریا
بے ثباتی نے انھیں پار اترنے نہ دیا

لے لیا ان سے عوض دل کی پریشانی کا
میری آہوں نے بھی زلفوں کو سنورنے نہ دیا

جل بجھی خود بھی اس الزام سے بچنے کے لیے
ساتھ پروانوں کا کیوں شمعِ سحر نے نہ دیا

اپنی زلفوں کو بناتے رہے شب بھر وہ جلیلؔ
میری بگڑی ہوئی زلفوں کو سنورنے نہ دیا

جلوۂ رخِ جاناں جس نے اک نظر دیکھا
پھر تو ہوش کا اس نے منہ نہ عمر بھر دیکھا

زندگی کے ہنگامے دیکھنے کو دیکھے تھے
موت کا تماشا بھی اِک حسیں پہ مر دیکھا

حق یہ ہے کہ ہے دنیا تیرا آئینہ خانہ
جس طرف نظر اٹھی تجھ کو جلوہ گر دیکھا

حسن کی عنایت ہے عشق کی عنایت ہے
تیری جلوہ گہہ دیکھی تجھ کو جلوہ گر دیکھا

آنکھ نے جدائی میں دل نے آشنائی میں
آہ رائیگاں دیکھی گریہ بے اثر دیکھا

شب کی بزم آرائی قابلِ تماشا تھی
شمع سے مگر پوچھو کیا دمِ سحر دیکھا

رو دیے جلیل آخر دیکھ کر وہ دل میرا
یاس کا مکاں دیکھا بے کسی کا گھر دیکھا

ضبطِ نالہ سے آج کام لیا
گرتی بجلی کو میں نے تھام لیا

ہائے ساقی پہ توبہ لوٹ گئی
ہاتھ میں اس ادا سے جام لیا

پھول کا جام جب گرا کوئی
ہم نے پلکوں سے بڑھ کے تھام لیا

آفریں تجھ کو حسرتِ دیدار
چشمِ تر سے زباں کا کام لیا

دل جگر نذر کر دیے مے کے
دے کے دو شیشے ایک جام لیا

اُلٹی اک ہاتھ سے نقاب ان کی
ایک سے اپنے دل کو تھام لیا

ترکِ مے کی ہوئی تلافی یوں
نام ساقی کا صبح و شام لیا

آ گئی کیا کسی کی یاد جلیلؔ
چلتے چلتے جگر کو تھام لیا

غش ہوں میں ان کے رنگِ محل پر
ہو گیا گم پہنچ کے منزل پر

کون ہے کس غریق بحر ہوا
سر پٹکتی ہیں موجیں ساحل پر

ٹوٹ کر مے پہ یوں گری توبہ
جیسے پروانہ شمعِ محفل پر

دردِ دل سے اٹھا نہیں جاتا
جب سے وہ ہاتھ رکھ گئے دل پر

گل کو توڑا تو یہ صدا آئی
رحم اے باغباں عنادل پر

اس نے دیکھا تھا اک نظر مجکو
تیر لاکھوں برس گئے دل پر

اُف یہ عالم کسی کے گیسو کا
چھائے جاتے ہیں ساری محفل پر

آ کے چلتی ہوئی نسیم بہار
کھول کر رہ گئے عنادل پر

ترکِ مے کا نہ پوچھو حال جلیل
اک قیامت گزر گئی دل پر

بے ترے کیا کروں جہاں لے کر
یہ زمیں اور یہ آسماں لے کر

اشک چھلکائے بال بکھرائے
وہ گئے میری داستاں لے کر

دو جہاں کی طلب سے فارغ ہوں
تیرا در تیرا آستاں لے کر

اُڑ گئے سب چمن کو رہ گئے ہم
چار تنکوں کا آشیاں لے کر

رنگِ محفل ترا بڑھانے کو
آئے ہم چشمِ خوں فشاں لے کر

سب گئے پوچھنے مزاج ان کا
میں گیا اپنی داستاں لے کر

سب پھرے لے کے اپنے یوسف کو
مَیں پھرا گردِ کارواں لے کر

سب اڑے لے کے پھول گلشن سے
اور ہم اپنا آشیاں لے کر

میری تقدیر کیا بتاؤں جلیلؔ
جا رہی ہے مجھے کہاں لے کر

نظر ان کی شوخی سے معمور ہو کر
گری دل پہ برقِ سرِ طور ہو کر

پلاتا ہے ساغر مجھے بیخودی کا
کوئی نشۂ حسن میں چُور ہو کر

تصور میں اب آنا جانا ہے ان کا
رہے دل میں آنکھوں سے وہ دُور ہو کر

شبِ وصل کیا چیز تھی کچھ نہ پوچھو
مرے گھر میں ظلمت رہی نور ہو کر

نہ چھپتا تو عنقا کی شہرت نہ ہوتی
ہوا حُسنِ مستور مشہور ہو کر

ہر اک ان کا خواہاں ہر اک ان کا طالب
پڑے کس مصیبت میں مشہور ہو کر

وہ دل لے کے خوش ہیں مجھے یہ خوشی ہے
کہ پاس ان کے رہتا ہوں میں دُور ہو کر

دکھا دے رخِ صبحِ اُمید یا رب
شبِ یاس اڑ جائے کافور ہو کر

جلیلؔ آؤ آنکھیں ملالیں ہم ان سے
کلیم آرہے ہیں سرِ طور ہو کر

راحت نہ مل سکی مجھے میخانہ چھوڑ کر
گردش میں ہوں میں گردشِ پیمانہ چھوڑ کر

خم میں، سبو میں، جام میں نیت لگی رہی
میخانے ہی میں ہم رہے میخانہ چھوڑ کر

آنکھوں کو چھوڑ جاؤں الٰہی میں کیا کروں
ہٹتی نہیں نظر رُخِ جانانہ چھوڑ کر

آتا ہے جی میں ساقیٔ مہوش پہ بار بار
لب چوم لوں ترا لبِ پیمانہ چھوڑ کر

ہوتی کہاں ہے دل سے جُدا دل کی آرزو
جاتا کہاں ہے شمع کو پروانہ چھوڑ کر

دو گھونٹ نے بڑھا دیے رندوں کے حوصلے
مینا و خم پہ جھک پڑے پیمانہ چھوڑ کر

پھر بوئے زلفِ یار نے آ کر ستم کیا
پھر چل دیا مجھے دلِ دیوانہ چھوڑ کر

یاد آئی کس کی آنکھ کہ رند اُٹھ کھڑے ہوئے
پیمانہ توڑ کر مے و میخانہ چھوڑ کر

دنیا میں عافیت کی جگہ ہے یہی جلیلؔ
جانا کہیں نہ گوشۂ میخانہ چھوڑ کر

کیا خوشی گر دل سے جائے دردِ دل
دل مرا خود ہے بجائے دردِ دل

فیض ہے یہ ایک مستِ ناز کا
میں کہاں تھا آشنائے دردِ دل

میں زباں سے کیا کہوں ہر اشکِ غم
کہہ رہا ہے ماجرائے دردِ دل

ہائے وہ دردآشنا تھا کس قدر
جس نے ڈالی ہے بنائے دردِ دل

بے قراری کی یہاں کچھ حد نہیں
اور ابھی ہے ابتدائے دردِ دل

دردمندِ عشق کی ہے آرزو
جان جائے پر نہ جائے دردِ دل

آپ آئیں پوچھنے میرا مزاج
میں تصدق میں فدائے دردِ دل

ہے تماشا پوچھتے ہیں سب مزاج
پوچھتا ہوں میں دوائے دردِ دل

ذکرِ دردِ دل پہ ہنستے تھے جلیلؔ
ہو گئے خود مبتلائے دردِ دل

کدھر چلے مرے اشکِ رواں نہیں معلوم
بھٹک رہا ہے کہاں کارواں نہیں معلوم

اٹھا دیا تو ہے لنگر ہوا کے جھونکوں میں
کدھر سفینہ ہے ساحل کہاں نہیں معلوم

ہماری بے خودیٔ شوق کا یہ عالم ہے
کہ آشیاں میں ہیں اور آشیاں نہیں معلوم

چمن میں عمر گزاری ہے آج تک لیکن
کسی کو نام کسی کو نشاں نہیں معلوم

فلک بھی پوچھ رہا ہے یہ لے کے انگڑائی
شبیہ کس کی ہے یہ کہکشاں نہیں معلوم

عجیب رنگ ہے نکھرا ہوا ان آنکھوں میں
پلا دی کس نے مئے ارغواں نہیں معلوم

پھنسا کے دام میں پیری کے بیکس و تنہا
کدھر گئی مری عمرِ رواں نہیں معلوم

ترانہ کش بھی ہزاروں ہیں نالہ کش بھی ہزار
مجھی سے کیوں ہے چمن بدگماں نہیں معلوم

حلال کر چکے پینے سے کب کے ہم توبہ
اب آئیں جھوم کے کیوں بدلیاں نہیں معلوم

اب کیا کروں تلاش کسی کارواں کو میں
گم ہو گیا ہوں پا کے ترے آستاں کو میں

بجلی کی تاک جھانک سے تنگ آ گئی ہے جان
ایسا نہ ہو کہ پھونک دوں خود آشیاں کو میں

اب مجھ سا پا شکستہ کہاں کارواں کہاں
پا جاؤں کاش گردِ پسِ کارواں کو میں

یاران رفتہ کیا ہوئے بیٹھا ہوں منتظر
پھر تلاش بھیج کے عمرِ رواں کو میں

گر بیخودی یہی ہے محبت کی راہ میں
ڈھونڈے گا کارواں مجھے اور کارواں کو میں

راحت ہو یا قفس میں مصیبت ہو کچھ بھی ہو
اتنا تو ہے کہ بھول گیا آشیاں کو میں

محویتِ نظارۂ گل کا یہ حال ہے
اب تک کہیں نہ باندھ سکا آشیاں کو میں

جس دن مئے الست کی موج آ گئی مجھے
رنگ دوں گا ایک رنگ میں سارے جہاں کو میں

میخانے کا قیام نہ بیکار تھا جلیل
آیا ہوں لے کے زندگیِ جاوداں کو میں

سب قطرہ قطرہ بٹ گئی اُس بزمِ ناز میں
جتنی بھری تھی مے مرے جامِ نیاز میں

آیا ہوں دور سے ترے دربار باز میں
کچھ پارۂ جگر لیئے دستِ نیاز میں

فریاد اے تصورِ ابروئے دلفریب
قبلہ کی سمت بھول گیا ہوں نماز میں

ایک ایک درسگاہِ جنوں ہے مرے لیے
حلقے ہیں جس قدر تری زلفِ دراز میں

لے کر جو بیٹھتے ہیں تصور میں ہم انھیں
راتیں گزار دیتے ہیں سوز و گداز میں

پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیمِ صبح
کچھ اُٹھ چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خوابِ ناز میں

میری تڑپ کہاں کسی پروانے کو نصیب
ہاں شمع کچھ شریک ہے سوز و گداز میں

میں شمعِ بزم ہوں نہ چراغِ مزار ہوں
راتیں مگر گزرتی ہیں سوز و گداز میں

دل پھونکتی ہے گرمیِ صوتِ طربِ جلیل
نغمے نہیں بھری ہوئی بجلی ہے ساز میں

افتادگی ہے شرط محبت کی راہ میں
یوسف کو بھی یہ چاہ گراں تھی ہے چاہ میں

وہ دل مجھے ملے جسے لذت ہو درد کی
اللہ کیا کمی ہے تری بارگاہ میں

اب ہوش ہے یہاں نہ سکوں ہے نہ صبر ہے
ہم سب کو چھوڑ آئے تری جلوہ گاہ میں

جادو تمھاری آنکھ کا کس پر چلا نہیں
دل سب کے ہیں بندھے ہوئے تارِ نگاہ میں

اب ہوش ہے کہاں کہ ہو نظارۂ جمال
میں کھو گیا پہنچ کے تری جلوہ گاہ میں

بکھری ہوئی وہ زلف اشاروں میں کہہ گئی
میں بھی شریک ہوں ترے حالِ تباہ میں

رحمت کی تھی ادھر نہ اگر چشمِ التفات
لذت کہاں سے آ گئی اتنی گناہ میں

کیا کوئی چشمِ لطف کا منشا سمجھ سکے
گہرائیاں غضب کی ہیں ان کی نگاہ میں

کی بیخودی نے خوب مری رہبری جلیلؔ
ساتھی تھے جتنے چھوٹ گئے مجھ سے راہ میں

کیوں اثر ہو نہ دِل کی آہوں میں
رہ چکا ہے تری نگاہوں میں

آسکے دیکھنے میں جلوۂ یار
اتنی وسعت کہاں نگاہوں میں

خضر کو ڈھونڈنے میں نکلا تھا
مل گئے میکدے کی راہوں میں

بند رہتی ہیں اس لیے آنکھیں
پھر رہا ہے کوئی نگاہوں میں

حُسن گوشے میں تھا کبھی لیکن
اب تماشا ہے شاہراہوں میں

کاش وہ دل میں میرے آجاتی
ہے جو مستی تری نگاہوں میں

اس سے اندازہ کر لو رحمت کا
میں بھی شامل ہوں بے گناہوں میں

رُخ نہ کرتے حرم کا کیا کرتے
بھیڑ تھی میکدے کی راہوں میں

آکے دو دن کو فصلِ گل ساقی
مبتلا کر گئی گناہوں میں

برقِ خرمن بنا ہُوا ہے جلیلؔ
نورِ توبہ بری نگاہوں میں

چشم بد دور ہیں جادو آنکھیں
آئینہ سے نہ لڑا تو آنکھیں

روئے رنگیں کا نظارہ کر کے
روتی ہیں خون کے آنسو آنکھیں

وہ مرے دل میں چھپے بیٹھے ہیں
ڈھونڈتی ہیں جنھیں ہر سو آنکھیں

قابلِ وصف ہیں گیسو عارض
قابلِ دید ہیں ابرو آنکھیں

اور اندھیر کیا کاجل نے
اور بھی بن گئیں جادو آنکھیں

آنکھ کیا تجھ سے ملاتے توبہ
رہ گئے کھول کے آہو آنکھیں

سحر عشاق پہ کرتے کرتے
بن گئیں مرکزِ جادو آنکھیں

شب گزر جاتی ہے لگتی ہی نہیں
کسی کروٹ کسی پہلو آنکھیں

آگ لگ جائے گی دامن میں جلیل
دم گریہ نہ چھپا تو آنکھیں

چلنے میں سانس خنجرِ براں سے کم نہیں
اب تو مرا جگر بھی گریباں سے کم نہیں

گلشن کا رنگ ہائے نہ پوچھو بہار میں
کانٹے بھی آجکل گل و ریحاں سے کم نہیں

کیونکر کہوں شراب کو میں ساقیا شراب
ہر بوند جس کی چشمۂ حیواں سے کم نہیں

اس رہگزر میں سجدہ کروں میں کہاں کہاں
ہر نقشِ پا مجھے درِ جاناں سے کم نہیں

جب توبہ ٹوٹتی ہے صدا دیتی ہے جلیلؔ
میں بھی کسی حسین کے پیماں سے کم نہیں

نقش قدم نے دی جگہ دیدۂ اعتبار میں
مثلِ غبارِ راہ ہیں ہم تری رہگذار میں

دل تو ہے گل مگر وہ گل جس پہ مجھے بھی رشک ہے
شام کو زلفِ یار میں صبح گلے کے ہار میں

مستِ ازل ہوں ساقیا مستی و سرخوشی نہ پوچھ
خم ہیں ہزاروں میکدے ایک مرے خمار میں

صبر نہیں سکوں نہیں ہوش نہیں خبر نہیں
کون سما رہا ہے یہ دیدۂ انتظار میں

جامِ الست میں جلیلؔ کیا تھی بلا کہ آج تک
دل بھی اسی سرور میں میں بھی اسی خمار میں

ستم کرنے والے یہاں اور بھی ہیں
تہیہ آسماں آسماں اور بھی ہیں

نگاہیں تری دیکھ کر میں نہ سمجھا
سوا اُس جہاں کے جہاں اور بھی ہیں

خدا رکھے درد و غم دے کسی کو
تمھیں اک نہیں مہرباں اور بھی ہیں

جگہ غنچے غنچے میں ہے بو کی صورت
ہمارے لیے آشیاں اور بھی ہیں

نکالے بہت دل سے چن چن کے کانٹے
تڑپ کہہ رہی ہے نہاں اور بھی ہیں

مٹاتے گئے مجھکو اِک اِک ادا پر
سُناتے گئے امتحاں اور بھی ہیں

فقط اشکِ خوں کیا ہیں آہوں کو دیکھو
پسِ کارواں کارواں اور بھی ہیں

مجھی پر ہیں کیوں باغباں کی نگاہیں
اسی شاخ پر آشیاں اور بھی ہیں

جلیل آہ دل کے شراروں کو دیکھو
ستارے سرِ آسماں اور بھی ہیں

عدم کے دشت میں پایا گیا ہوں
کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں

حقیقت دارِ فانی کی کہوں کیا
جہاں دم بھر کو ٹھہرایا گیا ہوں

نفس کی طرح کوچے میں کسی کے
ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں

نیا کچھ آج کا وعدہ نہیں ہے
یونہیں برسوں میں بہلایا گیا ہوں

ہے کس کی جلوہ گاہِ ناز محشر
اٹھا کر قبر سے لایا گیا ہوں

شکایت ہے یہ جامِ چشمِ تر کو
کہ ساری عمر چھلکایا گیا ہوں

کرامت کیوں نہ سمجھوں میکدے کی
پلا کر ہوش میں لایا گیا ہوں

میں گویا ایک شمعِ سوختہ تھا
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

جلیلؔ آنے لگی ہیں ہچکیاں کیوں
کہیں میں یاد فرمایا گیا ہوں

آخرش بیتابیاں راحت کا ساماں ہوگئیں
الجھنیں اتنی بڑھیں زلف پریشاں ہوگئیں

حسن کی رنگینیاں جس دم نمایاں ہوگئیں
جلوۂ رُخ سے نگاہیں گل بداماں ہوگئیں

کیا اثر موسم کا ہے گر کر گھٹا سے باغ میں
بجلیاں گل ہوگئیں گل سے گلستاں ہوگئیں

یہ غلط ہے حسن کو کچھ عشق کی پروا نہیں
آہ کی میں نے تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

طوق کیا زنجیر کیا جب اُٹھ چلا دستِ جنوں
پھر تو ساری ہستیاں میرا گریباں ہوگئیں

میں کوئی گلچیں نہیں لیکن جو آئی فصلِ گل
پھول سب کھل کر مرے دامن کی کلیاں ہوگئیں

حسن دیکھا ہے بہت لیکن وہ صورت اور ہے
پردہ اٹھا بھی نہیں اور آنکھیں حیراں ہوگئیں

پھول کیا کوئی حسیں کیا جب سے آئی ہے بہار
پیاری پیاری صورتیں سب آفتِ جاں ہوگئیں

حسرتوں کا سلسلہ کب ختم ہوتا ہے جلیلؔ
کھل گئے جب گل تو پیدا اور کلیاں ہوگئیں

نیا سودا نیا دردِ نہانی لے کے آیا ہوں
نئی اس بزم سے میں زندگانی لے کے آیا ہوں

کچھ اپنی ناتوانی کچھ ترا پاسِ نزاکت تھا
نگاہوں میں محبت کی کہانی لے کے آیا ہوں

ترے جلوے کے نظارے کو خالی ہاتھ کیا آتا
لُٹانے کو بہارِ نوجوانی لے کے آیا ہوں

لبوں پر مُہرِ خاموشی ہے آنکھیں ڈبڈبائی ہیں
اثر انداز اپنی بے زبانی لے کے آیا ہوں

خدا معلوم قاصد کیا سُنائے دل دھڑکتا ہے
یہ کہتا ہے کہ پیغامِ زبانی لے کے آیا ہوں

مژہ پر گرم گرم آنسو لبوں پر سرد سرد آہیں
فسانہ درد کا غم کی کہانی لے کے آیا ہوں

سرشکِ خونِ دل پُر داغ افسردہ تمنائیں
ازل سے یہ متاعِ زندگانی لے کے آیا ہوں

مقامِ خضر تھا یا میکدہ تھا کیا کہوں کیا تھا
جہاں سے میں حیاتِ جاودانی لے کے آیا ہوں

جلیلؔ ابرِ سیہ کیا جھومتا ہے سبزہ زاروں پر
یہ کہتا ہے کہ آبِ زندگانی لے کے آیا ہوں

کرم مجھ پہ کیا کیا وہ فرما رہے ہیں
ستم کر رہے ہیں ستم ڈھا رہے ہیں

نگاہوں کی مخمور گردش کے صدقے
کہ ہم بے پلائے پیئے جا رہے ہیں

خوشی کا سماں ہے ہنسی گلفشاں ہے
خبر آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

تمہیں وجہ بیتابئ جان و دل ہو
تمہاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

اثر یہ ہوا خندۂ گل کا ان پر
نئے پھول ہنس ہنس کے برسا رہے ہیں

تبسّم تھا اس رنگ سے ان کے لب پر
میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں

ہے آباد میرے تصوّر کی دُنیا
حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

جلیلؔ ان کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

رازِ عشق اظہار کے قابل نہیں
جرم یہ اقرار کے قابل نہیں

آنکھ پُر خوں عشق جگر دل داغدار
کوئی نذر یار کے قابل نہیں

دید کے قابل حسیں تو ہیں بہت
ہر نظر دیدار کے قابل نہیں

دے رہے ہیں مے وہ اپنے ہاتھ سے
اب یہ شے انکار کے قابل نہیں

جان دینے کی اجازت دیجئے
سر مرا سرکار کے قابل نہیں

چھوڑ بھی گلشن کو اے نرگس کہیں
یہ ہوا بیمار کے قابل نہیں

شاعری کو طبعِ رنگیں چاہیئے
ہر زمیں گلزار کے قابل نہیں

خامشی میری یہ کہتی ہے جلیلؔ
دردِ دل اظہار کے قابل نہیں

جس دن سے بلبلیں ہوئے دام و قفس گئیں
نظارۂ بہارِ چمن کو ترس گئیں

گم قافلے سے کون ہوا جس کے واسطے
جانیں نکل کے صورتِ بانگِ جرس گئیں

قاصد پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول
کہنا فقط یہ ان سے کہ آنکھیں ترس گئیں

نکلے کبھی ہوا میں جو کھولے ہوئے وہ بال
گلیاں تمام مشک کی خوشبو سے بس گئیں

آئیں دمِ نظارہ پلٹ کر نگاہیں کیا
زلفوں نے رُخ پہ دام بچھایا تھا پھنس گئیں

آنکھوں میں اشک تھے کہ سمندر بھرا ہوا
رویا جو میں بہت سی گھٹائیں ترس گئیں

کس کی یہ آہ گرم تھی صیاد دیکھنا
سب تیلیاں قفس کی ہوا سے جھلس گئیں

گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹولیاں
کچھ رو گئیں تو کچھ مری حالت پہ ہنس گئیں

بزمِ نشاط و عیش کا اب ذکر کیا جلیلؔ
وہ دن گئے وہ راتیں بھی اے ہمنشیں گئیں

کس کے جلوے یہ سبھی طور نظر آتے ہیں
دل کے پردے میں وہ مستور نظر آتے ہیں

ذرّہ ذرّہ سے نمایاں ہے تجلّی ان کی
میری نظروں سے مگر دُور نظر آتے ہیں

کشورِ حسن ترے زیرِ نگیں ہے جب سے
نئے آئیں نئے دستور نظر آتے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسّم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دُور نظر آتے ہیں

کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم
اک نظر میں مجھے سو طُور نظر آتے ہیں

تھک گیا قافلۂ زیست بھی چلتے چلتے
ابھی منزل کے نشاں دُور نظر آتے ہیں

میکدہ ہے کوئی یا جلوۂ جانانہ ہے
بے پیے سیکڑوں مخمور نظر آتے ہیں

ہر نظر اس کی چھلکتا ہوا ساغر ہے جلیلؔ
آج ہم پینے پہ مجبور نظر آتے ہیں

لاکھ دل مست ہو مستی کا عیاں راز نہ ہو
یہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹے بھی تو آواز نہ ہو

خوف ہے موسم گل میں کہ صبا کا جھونکا
طائرِ ہوش کے حق میں پرِ پرواز نہ ہو

دل بہت بلبلِ شیدا کا ہے نازک گلچیں
پھول گلزار کے یوں توڑ کہ آواز نہ ہو

کیا قیامت ہے وہ دل توڑ رہے ہیں میرا
اس گماں پر کہ چھپا اس میں کوئی راز نہ ہو

آئینہ ہاتھ میں ہے حسن کا نظارہ ہے
ان سے کہہ دو مری حالت نظر انداز نہ ہو

ہو کے وہ مستِ مئے ناز گلے لپٹے ہیں
ہوش کمبخت کہیں تفرقہ پرداز نہ ہو

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لیے
درِ قفس کا ہو کھلا طاقتِ پرواز نہ ہو

اہلِ دل کو جو لٹاتی ہے صدا نغمے کی
پردۂ ساز میں پنہاں تری آواز نہ ہو

تھام لینے دو کلیجہ مجھے ہاتھوں سے جلیلؔ
قصۂ دردِ جگر کا ابھی آغاز نہ ہو

ترا در چھوڑ کر جاؤں کہاں اے پیرِ میخانہ
پڑی ہے موجِ مے سے پاؤں میں زنجیرِ میخانہ

ادا مستی بھری، آنکھوں میں مستی، چال مستانہ
وہ مستِ ناز ہے سر تا قدم تصویرِ میخانہ

بہارِ گل نے آکر روحِ مستی پھونک دی شب میں
کھلے شیشے، چلے ساغر، کھلی تقدیرِ میخانہ

مبارک مے کشو کس حسن سے فصلِ بہار آئی
کسی نے زلف کھولی یا کھلی زنجیرِ میخانہ

یہاں سب لوٹتے ہیں مثلِ موسیٰ میں سمجھتا ہوں
کہ سنگِ طور سے شاید ہوئی تعمیرِ میخانہ

شرابِ عشق پی کر جو نہ بہکے ظرف اس کا ہے
کہ اِک اِک بوند اس کی رکھتی ہے تاثیرِ میخانہ

نہیں کھلتا جو درِ سرگوشیاں ہیں بادہ خواروں میں
کہ مثلِ توبہ چل کر توڑئیے زنجیرِ میخانہ

خم و جام و سبو کے نقش، مٹتے ہیں کہاں دل سے
چلا ہوں لے کے میخانے سے میں تصویرِ میخانہ

جلیلؔ ان مے کشوں پر کیوں نہ پھر پھر کر شباب آئے
وہ مے پیتے ہیں جس کا نام ہے اکسیرِ میخانہ

پروا نہیں اگر نہ ملے رہنما مجھے
ہے شمع راہ گرمیِ آہ رسا مجھے

صہبائے تند و تیز کے سو جام اِک طرف
اور اِک طرف خیال ترا ساقیا مجھے

آگے تو چارہ ساز سے درماں طلب تھا میں
اب درد دے رہا ہے نشانِ دوا مجھے

غش آگیا ہے اس رُخِ نازک کو دیکھ کر
دے لے نسیم دامنِ گل کی ہوا مجھے

وعدہ وہ کر رہے ہیں ذرا لطف دیکھئے
وعدہ یہ کہہ رہا ہے نہ کرنا وفا مجھے

جوشِ بہار و بادہ ہے مستوں کا شور ہے
توبہ پکارتی ہے الٰہی بچا مجھے

جز بیخودی گزر نہیں کوئے حبیب میں
گم ہوگیا جو میں تو ملا راستا مجھے

واماندگی سے پا نہ سکا قافلہ کو میں
تھک کر گئی پکار کے بانگِ درا مجھے

پھر توبہ ٹوٹنے کے ہیں آثار اے جلیلؔ
اٹھ اٹھ کے پھر ابھار رہی ہے گھٹا مجھے

بہک رہی ہے نظر بیخودی شباب میں ہے
کھلا نہ راز وہ بیدار ہے کہ خواب میں ہے

عجیب رنگ کسی چشمِ نیم خواب میں ہے
ہزار میکدہ اک ساغرِ شراب میں ہے

یہ حسن کی ہے کرامت کہ مدتیں گزریں
جب اس کو دیکھتے ہیں عالمِ شباب میں ہے

ستم کے ساتھ تغافل بھی ہے تماشا ہے
کہ فتنے جاگتے ہیں فتنہ ساز خواب میں ہے

بتاؤں کس کو شبِ غم انیسِ تنہائی
کہ ساتھ ہے مری تقدیر وہ بھی خواب میں ہے

عجب حسینوں کا مجمع ہے غنچہ و گل سے
دمِ سحر کوئی بیدار کوئی خواب میں ہے

اسی میں ہستی فانی کا راز مضمر ہے
حیات کی ہے شباہت تو کچھ حباب میں ہے

کبھی تو پردۂ ظلمات میں تھی آبِ حیات
یہ سن رہا ہوں کہ اب شیشۂ شراب میں ہے

پس فنا بھی ہے یہ انس میکدے سے جلیلؔ
کہ روح بادہ کشاں بن کے بو شراب میں ہے

بن سنور کر جو یار آتا ہے
پیشوائی کو پیار آتا ہے

جب انھیں دیکھو پیار آتا ہے
اور بے اختیار آتا ہے

ابر بھی دلجلوں کی تُربت پر
شمع ساں اشکبار آتا ہے

پیاری صورت وہ ہائے کیا ہوگی
جس کو بے دیکھے پیار آتا ہے

مژدہ اے دل جو لے گیا تھا قرار
ہو کے وہ بیقرار آتا ہے

دل جہاں حسن دیکھتا ہے وہاں
اڑ کے پروانہ وار آتا ہے

تیرا جلوہ ہے یار پردے میں
مجھ کو پردے پہ پیار آتا ہے

سنتے ہیں حشر کوئے جاناں میں
روز دیوانہ وار آتا ہے

ہم نے جانا نہ آج تک یہ جلیلؔ
دل میں کیونکر قرار آتا ہے

رُخ پہ قائم مری نظر نہ ہوئی
دیدِ جاناں ہوئی مگر نہ ہوئی

ٹوٹ کر کب شراب کی بوتل
لختِ دل، پارۂ جگر نہ ہوئی

وہ بجھائیں گے کیا لگی دل کی
مَیں جلا اُن کی آنکھ تر نہ ہوئی

ہے وہی گرمیِ شباب ہنوز
ڈھلنے والی یہ دوپہر نہ ہوئی

گرچہ شب بھر کھُلی رہیں آنکھیں
نیند کی شکل جلوہ گر نہ ہوئی

قصّۂ زیست ہوگیا کوتاہ
داستاں اپنی مختصر نہ ہوئی

دلِ پُر اضطراب کے ہاتھوں
ایک دن چَین سے بسر نہ ہوئی

کچھ نہ کہنا صبا بجُز اِس کے
کہ دوا کوئی کارگر نہ ہوئی

دل سے نکلی نہ کوئی آہ جلیلؔ
جو کلیدِ درِ اثر نہ ہوئی

روز افزوں تپشِ دل ہے خدا خیر کرے
نبض میری رگِ بسمل ہے خدا خیر کرے

تاکتے ہیں نگہۂ ناز سے جس پہلو کو
اسی پہلو میں مرا دل ہے خدا خیر کرے

اس کی نیرنگیٔ فطرت سے بہت ڈرتا ہوں
کبھی عیسیٰ کبھی قاتل ہے خدا خیر کرے

دَورِ مے دیکھئے کیا رنگ ہے لانے والا
شمع گریاں سرِ محفل ہے خدا خیر کرے

کھینچ کر پھر طرفِ یار مقدر لایا
وہی دلبر ہے وہی دل ہے خدا خیر کرے

اپنے وعدے سے پشیماں نہ ہوا ہو کوئی
کچھ دھڑکتا سا مرا دل ہے خدا خیر کرے

خوف ہے زیست کی گھڑیاں نہ کہیں کٹ جائیں
ہر نفس خنجرِ قاتل ہے خدا خیر کرے

بیخودی روکتی ہے آپ میں آؤں کیونکر
سخت دشوار یہ منزل ہے خدا خیر کرے

حشر اُٹھانے کو وہ بیٹھے ہیں جو بن ٹھن کے طفیل
شور برپا سرِ محفل ہے خدا خیر کرے

کچھ تو مجھے اے جلوۂ جانانہ بنادے
اپنا نہ بنا آپ سے بیگانہ بنادے

در پردہ مئے حسن سے مستانہ بنادے
پردہ نہ اٹھا اور مجھے دیوانہ بنادے

حد سے نہ تجاوز مری ہستی میں ہو ساقی
پیمانے میں ایسا کوئی پیمانہ بنادے

آئینۂ رُخ سے ترے ہٹتی نہیں آنکھیں
یہ ذوقِ نظر مجھ کو بھی تجھ سا نہ بنادے

میخانہ جو آنکھوں کو بنا رکھا ہے ساقی
مستی کو مری حاصلِ میخانہ بنادے

افسانہ طلب حسن ہے اس کا مجھے ڈر ہے
ظالم مری ہستی کو نہ افسانہ بنادے

پھر شوقِ تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت
پھر ذوقِ طلب مجکو تماشا نہ بنادے

دل کب سے ہے مشتاق ترا بادِ بہاری
آ اور بھی دیوانے کو دیوانہ بنادے

دل پھیر دیا آج جلیل اس نے یہ کہکر
دیوانہ ہے مجھ کو بھی نہ دیوانہ بنادے

شب کو ملنے کا گر پیام آئے
صبح کو ساتھ لے کے شام آئے

ایک دنیا رہی بہار کے ساتھ
شیشے آئے، خم آئے، جام آئے

درد و غم سے کے ہمیں رہے میخوار
ہو کے ناکام سب کے کام آئے

رنگِ مستی کو انقلاب نہیں
صبح آئے یہاں کہ شام آئے

لاکھ ساغر کا ایک ساغر ہے
لب پہ پیرِ مغاں کا نام آئے

بات وہ کر کہ تیری بات رہے
کام وہ کر کہ تیرے کام آئے

آج ہے وہ بہار کا موسم
پھول توڑوں تو ہاتھ جام آئے

بوئے گل تھا میں ہاتھ کیا آتا
کتنے صیاد لے کے دام آئے

میکدہ بھی عجب جگہ ہے جلیل
پختہ ہو کر گئے جو خام آئے

ترا یہ دور کیا اے باغباں ہے
قفس آباد ویراں آشیاں ہے

سفینہ ہے، ہوا ہے بادباں ہے
یہ سب کچھ ہے مگر ساحل کہاں ہے

مرے اشکوں کو بے قیمت نہ سمجھو
انھیں میں عمر بھر کی داستاں ہے

مزے کی ہے مری دیوانگی بھی
اسی سے پوچھتا ہوں تو کہاں ہے

ابھی باقی ہیں گھڑیاں زندگی کی
ابھی ہلکا سا پردہ درمیاں ہے

کرم فرما ہے جب سے ناز تیرا
طبیعت بے نیازِ دو جہاں ہے

کوئی کیوں روئے کیوں آنسو بہائے
مرا قصہ ہے میری داستاں ہے

وہ روٹھے غم بڑھا تقدیر بگڑی
مصیبت کارواں در کارواں ہے

جلیلؔ آنکھیں کسی کی جب سے دیکھیں
مری آنکھوں میں اِک عالم نہاں ہے

چال سے فتنۂ خوابیدہ جگاتے آئے
آپ جب آئے قیامت ہی اٹھاتے آئے

نالۂ گرم سے آشنا نہ کیا تھا رسوا
اشک کمبخت تو اور آگ لگاتے آئے

دل کو میں ان کی نگاہوں سے بچاتا کیونکر
دور سے تیر نشانے پہ لگاتے آئے

آئے ہم سوئے قفس چھوڑ کے جب گلشن کو
آہ سے آگ نشیمن میں لگاتے آئے

طے ہوئی آہ کی تائید سے منزل اپنی
جابجا راہ میں ہم شمع جلاتے آئے

اس غرض سے کہ نہ دیکھے کوئی صورت انکی
خرمنِ ہوش پہ بجلی وہ گراتے آئے

ان کی کیا بات جو ہنس ہنس کے لبِ رنگیں سے
پھول برسانے گئے باغ لگاتے آئے

آئے محفل میں وہ اُلٹے ہوئے چہرے سے نقاب
دولتِ حسنِ خداداد لُٹاتے آئے

چال تھی مست نظر مست ادا مست ملیحؔ
ذرے ذرے کو وہ میخانہ بناتے آئے

زہے مشقِ تصور خوش نصیب ایسے بھی کم نکلے
جو لے کر آئینہ دیکھا تری صورت میں ہم نکلے

ہوا کھانے چلے ہیں اس ادا کے ساتھ وہ گھر سے
چمن سے جھومتی جیسے نسیمِ صبحدم نکلے

اسی کو بارک اللہ حسن کا اعجاز کہتے ہیں
تری صورت پہ پیار آئے تری صورت پہ دم نکلے

چمن میں لالہ و گل سے رہی رونق نہ دو دن بھی
چمن کی آنکھ کے تارے چراغِ صبحدم نکلے

ٹپکنا اشک کا تمہید ہے دیدار کی جیسے
طلوعِ مہر سے پہلے ستارہ صبحدم نکلے

نہ وہ آئیں کہ راحت ہو نہ موت آئے کہ فرصت ہو
پڑا ہے دل کشاکش میں نہ غم نکلے نہ دم نکلے

رُخِ روشن کے آگے پھولنا پھلنا تو کیا ممکن
تری محفل سے بجھ بجھ کر چراغِ صبحدم نکلے

جلو میں کون ہو کیا فکر اس کی وہ سمجھتے ہیں
قیامت ساتھ ہولیگی جہاں گھر سے قدم نکلے

جلیلؔ اس شوق کے صدقے کہ ہم راہِ محبت میں
چلے تھے سب سے پیچھے سب کے آگے دو قدم نکلے

پلا ساقی بہار آئے نہ آئے
گھٹا پھر بار بار آئے نہ آئے

تجھے ہم دیکھنے آئیں گے سو بار
کوئی دیوانہ وار آئے نہ آئے

کہے جائیں گے درد دل ہم اپنا
کسی کو اعتبار آئے نہ آئے

وہ آ جائیں ادھر کھولے ہوئے بال
نسیمِ مُشکبار آئے نہ آئے

تمھیں آرام سے سونا مبارک
مجھے شب بھر قرار آئے نہ آئے

ہوائے شوق میں اب اُڑ چلے ہم
ہوائے کوئے یار آئے نہ آئے

ترے دل میں مسرت کے کھلیں پھول
مرے دل میں بہار آئے نہ آئے

جلیلؔ اب مے کشی کا لطف اٹھاؤ
پھر ابرِ نو بہار آئے نہ آئے

دل ہے مضطر ان کے آنے کے لیے
ہوش جاتے ہیں بلانے کے لیے

روٹھتا ہے دل سے جب ان کا خیال
درد اٹھتا ہے منانے کے لیے

باغ میں شرمیلی کلیوں کو صبا
گدگداتی ہے ہنسانے کے لیے

اس بھرے گلشن سے ہم نے کیا لیا
چار تنکے آشیانے کے لیے

جاتے ہیں مشتاق اب بھی طور پر
آنکھ بجلی سے لڑانے کے لیے

گردشِ ساغر کہاں تک ساقیا
چھوڑنا تھا کچھ زمانے کے لیے

ان کا جلوہ خود فروش و خودنما
ان کا پردہ ہے دکھانے کے لیے

سرگزشت اپنی محبت میں جلیلؔ
درسِ عبرت ہے زمانے کے لیے

زندگی موت کی تصویر نظر آتی ہے
یہی اس خواب کی تعبیر نظر آتی ہے

ہائے کیسی ہے جنوں خیز ہوائے گلزار
ہر رگِ گل سے مجھے زنجیر نظر آتی ہے

نہ تکلم نہ تبسم نہ لگاوٹ نہ کلام
کچھ کشیدہ تری تصویر نظر آتی ہے

محویت مجکو اب ایسی ہے کہ آئینے میں
اپنی صورت تری تصویر نظر آتی ہے

حال باقی نہ رہا کچھ ترے دیوانے میں
اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

میکدہ چھوڑ کے جاؤں میں کہاں مستی میں
لغزشِ پا سے مجھے زنجیر نظر آتی ہے

موسم گل میں حسینوں کا مرقع ہے چمن
جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

روز بن بن کے بگڑتی ہے جو تدبیرِ وصال
اس میں کچھ سازشِ تقدیر نظر آتی ہے

ان کی رفتار کا انداز کہوں کیا میں جلیلؔ
ایک چلتی ہوئی شمشیر نظر آتی ہے

بنائے عیش یہ تو نے کہاں پیرِ مغاں رکھ دی
کہ بھر کر جام و مینا میں شرابِ ارغواں رکھ دی

حرم کی راہ طے کی گرتے پڑتے اس طرح میں نے
جہاں نقشِ قدم دیکھا جبیں اپنی وہاں رکھ دی

مبارکباد دو صیّاد کو صرصر کو بجلی کو
سرِ شاخِ چمن بلبل نے طرحِ آشیاں رکھ دی

چھپا رکھی تھیں دل نے کیسی کیسی راز کی باتیں
ذرا سے اشکِ خوں نے کھول کر سب داستاں رکھ دی

نہالِ آرزو کے جس زمیں پر پھول کھلتے تھے
اٹھا کر وہ زمیں تو نے کہاں اے آسماں رکھ دی

ارادت کا اثر دیکھو عقیدت اس کو کہتے ہیں
حرم کی وہ زمیں نکلی جبیں میں نے جہاں رکھ دی

خموشی کی ادا پر ناز تھا منہ بند کلیوں کو
نسیمِ صبحدم نے توڑ کر مہرِ دہاں رکھ دی

جلیلؔ اشعار سے گرما رہے ہو تم جو محفل کو
تمھارے منہ میں گویا شمع نے اپنی زباں رکھ دی

بنا دیا میکدہ چمن کو صبا کی مستی بھری ادا نے
اڑا دیے ہوش میکشوں کے ہوا میں اڑتی ہوئی گھٹا نے

شباب نے ان کی سادگی کی بساط ساری الٹ کے رکھ دی
ادا پہ شوخی کا نقش بیٹھا نگہ پہ قبضہ کیا حیا نے

ملا نہ لطفِ وصال لیکن مزے کا شب بھر رہا تماشا
ادھر کھلا بند اس قبا کا گرہ لگا دی ادھر حیا نے

یہ آپ کیا مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہوش کس نے اڑا دیے ہیں
کچھ آپ کی زلفِ مشکبو نے کچھ آپ کی چشمِ فتنہ زا نے

ہوا گلستاں کی کھل کے دل کو جلیلؔ تسکین ہو چلی تھی
کسی کی پھر یاد تازہ کر دی گلوں کا منہ چوم کر صبا نے

اک آہ جگر سے جگر و دل کی خبر لے
بسمل کوئی ایسا ہو کہ قاتل کی خبر لے

آتی نہیں اب دیر سے آوازِ جرس بھی
ہے کون جو آوارۂ منزل کی خبر لے

اٹھتی ہے سرِ شام نقابِ رُخِ جاناں
کہہ دو یہ فلک سے مہِ کامل کی خبر لے

تڑپوں تہِ خنجر تو نیا رنگ ہو پیدا
ہر قطرۂ خوں دامنِ قاتل کی خبر لے

بیتابِ محبت میں جلیلؔ ایسی تڑپ ہے
دریا میں جو ڈوبے لبِ ساحل کی خبر لے

آپ ہی سے گھر مرا آباد ہے
صورت آنکھوں میں ہے دل میں یاد ہے

جو کھٹک ہے دل میں کیا سمجھوں اسے
تیر ہے تیرا کہ تیری یاد ہے

کر گئی سونا چمن بادِ خزاں
صید ہے کوئی نہ اب صیاد ہے

وہ نظر جس سے لیا تھا ہم نے دل
مدتیں گزریں ابھی تک یاد ہے

ہر کلی گلشن کی مرجھائی ہوئی
سوگوار بلبلِ ناشاد ہے

کائناتِ زندگی کہئے اسے
دل ہے جب تک دل میں اسکی یاد ہے

پیچھے پیچھے بلبلوں کی ٹولیاں
آگے آگے نکہتِ برباد ہے

رنگ کیا بدلا کہ جاتے ہی بہار
تھا جو نغمہ اب وہی فریاد ہے

دردِ دل کہنے کی کیا حاجت جلیلؔ
میری خاموشی لبِ فریاد ہے

یہ رنگِ جنوں کہیں نہیں ہے
دامن ہے تو آستیں نہیں ہے

سر تا بقدم ہے نور ہی نور
وہ ماہ ہے مہ جبیں نہیں ہے

کب سنگِ در اس کا ہم نے چھوڑا
جب دیکھ لیا جبیں نہیں ہے

اس گل کا چمن چمن ہوں جویا
جس گل کا پتا کہیں نہیں ہے

پھرتی ہے صبا لئے مرا دل
برگِ گل دیا سمیں نہیں ہے

صورت تو وہ اپنی دیکھتے ہیں
حالت کا مری یقیں نہیں ہے

اے جاں جو تم ہو شمعِ بالیں
کچھ غمِ دمِ واپسیں نہیں ہے

ہو آئے جلیل کعبہ و دَیر
اس بت کا پتہ کہیں نہیں ہے

رندوں کو غمِ بادۂ گلفام نہیں ہے
آنکھیں تو ہیں ساقی کی اگر جام نہیں ہے

جب تک خلشِ درد تھی یک گونہ مزا تھا
جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

میں خوش تصور بھی جسے بارِ گراں ہے
اس کے لبِ نازک پہ مرا نام نہیں ہے

کٹتی ہے نہ گھٹتی ہے نہ ہٹتی ہے شبِ غم
اس پر اثرِ گردشِ ایام نہیں ہے

کچھ دام و قفس پر نہیں موقوف اسیری
بلبل کے لیے کیا رگِ گل دام نہیں ہے

چلنے کی اجازت ہے فقط تیغ رواں کو
قاتل کی گلی رہگزرِ عام نہیں ہے

دیکھی ہیں بڑے غور سے میں نے وہ نگاہیں
آنکھوں میں مروت کا کہیں نام نہیں ہے

تم یاں سے گئے کیا مری دنیا ہی بدل دی
وہ لطف نہیں وہ سحر و شام نہیں ہے

ناداں ہیں جو دیتے ہیں جلیلؔ آپ کو الزام
اس دور میں کس کو ہوسِ جام نہیں ہے

ادا ادا تری موجِ شراب ہو کے رہی
نگاہِ مست سے دنیا خراب ہو کے رہی

غضب تھا ان کا تلوّن کہ چار ہی دن میں
نگاہِ لطف نگاہِ عتاب ہو کے رہی

تری گلی کی ہوا دل کو راس کیا آتی
ہوا یہ حال کہ مٹی خراب ہو کے رہی

وہ آہِ دل جسے سن سُن کے آپ ہنستے تھے
خدنگِ ناز کا آخر جواب ہو کے رہی

پڑی تھی کشتِ تمنّا جو خشک مدّت سے
رہینِ منّتِ چشمِ پُرآب ہو کے رہی

ہماری کشتیِ توبہ کا یہ ہوا انجام
بہار آتے ہی غرقِ شراب ہو کے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا ان کو
اٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہو کے رہی

وہ بزمِ عیش جو رہتی تھی گرم راتوں کو
فسانہ ہو کے رہی ایک خواب ہو کے رہی

جلیلؔ فصلِ بہاری کی دیکھئے تاثیر
گری جو بوند گھٹا سے شراب ہو کے رہی

دلِ مستِ محبت نہ کہیں جوش میں آئے
دیوانے سے کہہ دو کہ ذرا ہوش میں آئے

سمجھا میں یہی جھومتی آئیں جو گھٹائیں
میخانے کو میکش لئے آغوش میں آئے

حاجت نہ رہی عرضِ تمنا کی زباں سے
جذبات کچھ ایسے لبِ خاموش میں آئے

چھپتا ہے کسی دل میں کہاں رازِ محبت
ساغر سے چھلک جائے جو مے جوش میں آئے

سنتے ہیں جلیل آج ہوئے تارکِ صہبا
ہے شکر کی جا اب بھی اگر ہوش میں آئے

گرمیاں اب وہ نہیں دل کی خدا خیر کرے
شمع بجھنے کو ہے محفل کی خدا خیر کرے

اس نے مستی میں اس انداز سے انگڑائی لی
میں پکارا جگر و دل کی خدا خیر کرے

دام ہی دام رگِ گل کے بچھے ہیں ہر سُو
موسمِ گل میں عنا دل کی خدا خیر کرے

دل جلے سب ترے قُربان ہوئے جاتے ہیں
ایسی محفل ہے تو محفل کی خدا خیر کرے

منزلیں دشتِ محبت کی ہیں دشوار جلیلؔ
میں تو کیا رہبرِ منزل کی خدا خیر کرے

آج تک دل کی آرزو ہے وہی
پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی

سو بہاریں جہاں میں آئی گئیں
مایۂ صد بہار تو ہے وہی

جو ہو پوری وہ آرزو ہی نہیں
جو نہ پوری ہو آرزو ہے وہی

مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو
بھول جاتا ہوں میں کہ تو ہے وہی

تجھ سے سو بار مل چکے لیکن
تجھ سے ملنے کی آرزو ہے وہی

صبر آجائے اس کی کیا اُمید
میں وہی، دل وہی ہے تو ہے وہی

ہو گئی ہے بہار میں کچھ اور
ورنہ ساغر وہی سبو ہے وہی

عمر گزری تلاش میں لیکن
گرمی ہائے جستجو ہے وہی

میکدے کا جلیل رنگ نہ پوچھ
رقص جام و خم و سبو ہے وہی

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے
یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے

وہ اُٹھے درد اُٹھا حشر اُٹھا
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

لگی تھی ان کے قدموں سے قیامت
میں سمجھا ساتھ سایا جا رہا ہے

زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے
جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

مرے داغِ جگر کو پھول کہہ کر
مجھے کانٹوں میں کھینچا جا رہا ہے

بہار آئی کہ دن ہولی کے آئے
گلوں میں رنگ کھیلا جا رہا ہے

رواں ہے عمر اور انسان غافل
مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے

سرِ میّت ہے یہ عبرت کا نوحہ
محبّت کا جنازا جا رہا ہے

جلیل اب دل کو اپنا دل نہ سمجھو
کوئی کر کے اشارا جا رہا ہے

کیا کام کر رہی ہے نظر کچھ نہ پوچھئے
گہرے ہیں کتنے زخمِ جگر کچھ نہ پوچھئے

اشکوں کے سامنے نگہِ اعتبار سے
کیسے گرے ہیں لعل و گہر کچھ نہ پوچھئے

دیکھا ہے جب سے رُخ کو ہم آغوشِ زلف کے
کٹتی ہے کیسے شام و سحر کچھ نہ پوچھئے

جب پوچھتے ہیں وہ دلِ پر خوں کا ماجرا
کہتے ہیں میرے دیدۂ تر کچھ نہ پوچھئے

افشائے راز ہو نہ کہیں دیکھئے جمیلؔ
مستوں سے میکدے کی خبر کچھ نہ پوچھئے

نظر فریب بہارِ خم و سبو کیا ہے
کمند ہے مئے توبہ شکن کی بو کیا ہے

بڑھا دی رونقِ گلشن ٹپک کے آنکھوں سے
نچوڑ ہے گلِ تر کا مرا لہو کیا ہے

سکونِ دل کا یہی خون کرتی رہتی ہے
خلش ہے پھانس ہے نشتر ہے آرزو کیا ہے

حیا سے حسن کی قیمت دوچند ہوتی ہے
نہ ہو جو آب تو موتی کی آبرو کیا ہے

جلیل عیش میں گزرے کہ رنج میں گزرے
مجالِ دم زدن و جائے گفتگو کیا ہے

کیفِ جامِ ارغوانی اور ہے
نشۂ جوشِ جوانی اور ہے

حالِ دل آہیں بھی کہتی ہیں مگر
اشکِ خوں کی ترجمانی اور ہے

پھول گلشن کے کھلے مرجھا گئے
وہ گلِ باغِ جوانی اور ہے

سب ہیں ان کے دیکھنے والے مگر
آئینے پر مہربانی اور ہے

کیا کہوں مر مر کے جینے کا مزا
اے خضر یہ زندگانی اور ہے

یوں تو سب کچھ ہے زبانِ شمع پہ
کہتی ہے جو بے زبانی اور ہے

بیکسی کو بھی مٹاتے جائیے
مرمٹوں کی یہ نشانی اور ہے

اشک خوں پھر آنکھ سے ٹپکے جلیلؔ
کیا کوئی رازِ نہانی اور ہے

بہاریں لٹا دیں، جوانی لٹا دی
تمہارے لیے زندگانی لٹا دی

صبا نے تو برسائے گل فصل گل میں
گھٹا نے مئے ارغوانی لٹا دی

اداؤں پہ کر دی فدا ساری ہستی
نگاہوں پہ دنیائے فانی لٹا دی

عجب دولت حسن پائی تھی دل نے
نہ مانی بری اِک نہ مانی لٹا دی

نہ کھونا تھا غفلت میں عہدِ جوانی
عجب رات تھی یہ سہانی لٹا دی

نہ کی حسن کی قدر اے ماہِ کامل
فقط رات بھر میں جوانی لٹا دی

حسینوں نے رنگینیٔ خوابِ شیریں
سنی جب ہماری کہانی لٹا دی

عجب حوصلہ ہم نے غنچہ کا دیکھا
تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

جلیل آپ کی شاعری پر کسی نے
نگاہوں کی جادو بیانی لٹا دی

ساغر نہ چاہیئے مجھے مینا نہ چاہیئے
ساقی بس اک نظر مجھے مستانہ چاہیئے

کثرت سے گل کھلاتی ہے کچھ سوچ کر نسیم
ہر رند کو بہار میں پیمانہ چاہیئے

توبہ کا نام لے کے پشیماں ہوں ساقیا
کس منہ سے اب کہوں مجھے پیمانہ چاہیئے

ہر ایک چاہتا ہے کہ روشن ہو اپنا نام
محفل کو شمع شمع کو پروانہ چاہیئے

کافی ہے بوئے مے مری ہستی کو ساقیا
پیمانہ دے اُسے جسے پیمانہ چاہیئے

موسیٰ کے ساتھ اور بھی لوٹیں تو سیر ہو
چھوٹا سا ایک طور پہ میخانہ چاہیئے

نازک خیال ہوں یہ رہے ساقیا خیال
پینے کو پھول پھول سا پیمانہ چاہیئے

ظرف اور ہو گیا ترے مستوں کا ساقیا
پیمانہ اب نہ چاہیئے میخانہ چاہیئے

ساقی سے مانگنے میں عجب کیف ہے جلیلؔ
میری شراب ہے مجھے پیمانہ چاہیئے

خوشی کی روشنی میں بھی سوادِ غم نمایاں ہے
مری صبحِ وطن پروردہ شامِ غریباں ہے

بہت ہی مختصر ہے زیست کا اپنی جو ساماں ہے
اِک آہِ سرد ہے اِک یاس ہے اِک دردِ پنہاں ہے

دوبالا رنگِ مستی ہو گیا رنگینئ مے سے
کہ میں ساغر بکف ہوں اور ساغر گل بداماں ہے

بہارِ گل کا ہوں مرہونِ منت میں بھی اے گلچیں
ترے دامن میں گل ہیں میرے دامن میں گریباں ہے

ستم سب توڑ لیکن محتسب ٹوٹے نہ دل میرا
اسی شیشے میں سارے میکدے کا راز پنہاں ہے

نگاہِ ناز کو یارب دلِ بیتاب کیا سمجھے
تپش کہتی ہے بجلی ہے خلش کہتی ہے پیکاں ہے

ہمارے قتل میں بحث آپڑی ہے سخت جانی سے
قضا کہتی ہے مشکل ہے ادا کہتی ہے آساں ہے

صبا سرگوشیاں کیا کر رہی ہے غنچہ و گل سے
الٰہی خیر ہو کیوں بوئے گل اتنی پریشاں ہے

جلیل الطافِ شاہانہ کی ہے تفسیر یہ مصرع
مقدر پر مجھے نازش مقدر مجھ پہ نازاں ہے

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
اصول طب	سید کمال الدین حسین ہمدانی	116/=
امراض النساء (چوتھا ایڈیشن)	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	150/=
امراض الاطفال (دوسری طباعت)	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	92/=
امراض اور ان کی حقیقت (حصہ اول)	حکیم ایم۔ حشام صدیقی	23/=
بچے کی صحت	ڈاکٹر مس ستیہ گپتا / ڈاکٹر شمیم نکہت	6/=
پیٹ کے کیڑے	محمد رفیق اے۔ ایس	30/=
پیڑ پودوں پر وائرس کی بیماریاں	رشید الدین احمد	6/50
تاریخ طب	حکیم سید محمد حسان نگرامی	110/=
تشریح الہیکل (اول)	حکیم ایس۔ ایم۔ کمال الدین / حسین ہمدانی	11/=
تشریح الاحشاء	حکیم ایس، ایم، کمال الدین ہمدانی	23/=

تیمارداری (ترمیم واضافے کے ساتھ) (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر حسین فاروقی	16/=
چینی طب آکیوپنکچر وماکسی بوشن کے بنیادی اصول	ڈاکٹر محمد ظہیر الدین	12/=
چند عام بیماریاں	ڈاکٹر حسین فاروقی	9/=
درد۔ علامت اور علاج	حکیم ابو سعد خالد جاوید	17/=
ذہنی حفظانِ صحت	مترجم: ہرالڈ ڈبلو برنارڈ رمعین الدین	60/=
سرطان کیا ہے؟	محمد برہان حسین	7/=
شراب نوشی اور منشیات کی لت	ڈاکٹر حسین فاروقی	8/=
علم الادویہ	حکیم محمد مستان علی	46/=
عہد مامون کے طبی و فلسفیانہ ترجمہ کا تحقیقی مطالعہ	ڈاکٹر عشرت اللہ خاں	40/=
فطری علاج	حسن الدین احمد اور غلام احمد	16/=
قبالیات (دوسری طباعت)	محمد عباس رضوی	62/=
قدیم علم الامراض	حکیم ملک امین واثق	34/=
کتاب المرشد	محمد بن زکریا رازی ر محمد رضی السلام ندوی	15/=
کلیات نبض و بول و براز	حکیم حافظ سید حبیب الرحمٰن	زیر طبع
ماہیت الامراض	ڈاکٹر سید اسد رضا زیدی	40/=
مبادیات طب پر ایک تحقیقی نظر	حکیم الطاف احمد اعظمی	11/=
معالجات (حصہ اوّل)	حکیم وسیم احمد اعظمی	104/=
معالجات (حصہ دوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	120/=
معالجات (حصہ سوم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	120/=
معالجات (حصہ چہارم)	حکیم وسیم احمد اعظمی	100/=